رمضان مبارک
بچوں کا خوبصورت میگزین، روایت اور جدت ایک ساتھ
ماہنامہ
لاہور
الف نگر
ALIF NAGAR
مارچ، اپریل 2022
مزاح نمبر

New Arrival

Rs 600

+ Delivery Charges

To Order contact

0321 8460220

الف نامہ

پیارے دوستو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اُمید ہے کہ آپ سب اپنے سالانہ امتحانات سے فراغت پا چکے ہوں گے اور بہت اچھے نمبروں کے ساتھ کامیابی کی اگلی سیڑھی پر قدم رکھ چکے ہوں گے۔ ہماری طرف سے امتحانات میں کامیاب ہونے والے سب پیارے بچوں کو بہت مبارکباد قبول ہو اور وہ بچے جو کسی نہ کسی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکے ہمت نہ ہاریں اور اس بار خوب محنت کریں اور بھرپور کامیابی حاصل کر کے اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کریں۔

بچوں!

یہ بات آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مارچ کا مہینہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اس مہینے 1940 کو قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تھی۔ انگریزوں اور ہندوؤں جیسے طاقتور دشمن کے سامنے ایک الگ وطن کا مطالبہ رکھنا اور اُسے بھرپور طریقے سے منوانا نا صرف ایک بہت بڑا کارنامہ ہے بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اَن تھک محنت، ہمت، لگن، بہادری اور ثابت قدمی سے دشمن کے سامنے ڈٹ جانا آپ کو کامیابی دلاتا ہے۔

دوستو!

کہتے ہیں خوش کلامی ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔ اس لیے ہمیشہ اپنا اخلاق اچھا رکھیں اور طنز سے گریز کریں۔ آپ کا پسندیدہ میگزین آپ کی پُرزور فرمائش پر مزاح نمبر نکال رہا ہے۔ کہانیاں پڑھ کر آپ کو طنز اور مزاح کا باریک سا فرق سمجھ آئے گا۔ طنز وہ ہوتا ہے جس میں کسی کا مذاق اُڑایا جائے یا اُس کی تضحیک کی جائے اور مزاح جس میں دو لوگ کسی بات پر نا صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ دل کھول کر ہنستے بھی ہیں۔ مزاح کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائیے اور طنز کو زندگی سے نکال دیں۔

آخر میں آپ سب کو رمضان کریم کی آمد بہت مبارک ہو۔ اس مہینے نیک عمل کریں کیونکہ ہر نیکی کا ثواب ستر گنا بڑھ جاتا ہے۔ اپریل فول منا کر کسی کی بھی دل آزاری کی وجہ نہ بنیں۔ مئی، جون کا شمارہ ایڈونچر نمبر ہوگا۔ آپ کی دلچسپ تحاریر کا انتظار رہے گا۔ آپ سب دل کھول کر مسکرائیے اور دوسروں کی مسکراہٹ کی وجہ بنیں۔

والسلام

(ادارہ)

ماہنامہ الف نگر لاہور

ALIF NAGAR

جلد: 04 مارچ، اپریل 2022ء شمارہ: 11-10

عمیرہ احمد
چیف کانٹینٹ آفیسر

عائشہ اطہر
ایڈیٹر

آمنہ ارشد
سب ایڈیٹر

حسن عمر
معاون

ثمین توقیر
آرٹ منیجر

محمد عباس حسین
گرافک ڈیزائننگ

ثاقب سلطان
کمپوزنگ

روحیل آفتاب
ایڈورٹائزنگ / مارکیٹنگ / سرکولیشن
0321 846 0220

زیرِ اہتمام: الف کتاب پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

قیمت
فی شمارہ -/150 روپے | سالانہ (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) -/1000 روپے

خط وکتابت کے لیے: ماہنامہ الف نگر B-1، وائٹ ہاؤس لین 2، سندرداس روڈ، لاہور۔

فون نمبر: 042-36300351 | 0306-6665360

فیس بک: alifnagarofficial یوٹیوب: alifnagarofficial

ای میل: submissions.alifnagar@alifkitab.com

کھل جا سم سم

مارچ، اپریل 2022ء

03 نعت — بنت مسعود احمد
04 نانی اور خوشیوں کا دابا — مدیحہ شاہد
06 ہمارا پاکستان — فضہ شکیل
08 سوا سیر — الطاف حسین
13 دادا جان کی بیٹھک — سید علی یمین
14 بھوت سے ملاقات — مہوش اسد شیخ
17 الف نگر بہت پیارا (نظم) — ایوب اختر
18 تھوڑا ہنس لیں — حمیرہ وحید الرحمن شیخ
20 چھوٹی بی کے کارنامے — ریحانہ اعجاز
22 خوشی کی خوشی — قرۃ العین خرم ہاشمی
24 رمضو چاچا کا رمضان — عائشہ اطہر
27 بندر کی شادی (نظم) — شازیہ ستار نایاب
28 بنگلہ نمبر 407 — احمد شیر خان
30 ہوا کے ساتھ ساتھ — احمد عدنان طارق
32 بانی جن — سیدہ اقرا اعجاز
34 شیف نانی — صائمہ مسلم
35 اڑن طشتری کا تجربہ — محمد احمد رضا انصاری
38 منتو کی نانی بڑی سیانی — روبینہ کبیر خان
40 میٹھے سیب — حافظ محمد احمد
43 کیا روتی ہے (نظم) — ارسلان اللہ خان
46 احمق تاجر چالاک چور — حسن عمر
48 چچا خوامخواہ اور جھگڑو میاں — عائشہ اطہر
50 پراسرار ہاتھ — امان اللہ نیر شوکت
53 چڑیا (نظم) — حمیرا نوشین
54 آئے تن کی تپش — حنیف ملک
58 وطن تجھ پر قربان (نظم) — درخشندہ بیگ
66 بنائیے
67 آنٹی توڑ پھوڑ — فرزین لہرا
70 چچا چھکن بنے یوٹیوبر — محمد مبشر عطاری
72 میل ملاقات — صائمہ آصف

نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

بنت مسعود احمد

دلوں کا اجالا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت
غموں میں سہارا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

عبادت ہماری شریعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی
اثاثہ ہمارا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

ہے راحت، ہے رحمت، سراپا ہے شفقت
ہے دلکش نظارا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

مٹا دے جو ظلمت، جہالت کو یکسر
مثالی سراپا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

اطاعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اطاعت ہے رب کی
ہے قرآں پکارا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

مداوا گناہوں کا کیسے ہو ممکن؟
یہ ہی اک سہارا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

یہ نعمت، یہ رفعت، ہے اُمت کی نصرت
چمکتا ستارا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

نانی اور خوشیوں کا ڈبّہ

مدیحہ شاہد

رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اس بار رمضان میں نیک نانی بھی ڈھیر ساری سوغاتیں لیے گاؤں سے لاہور آ گئیں۔ یوں تو ان کا نام نیک بی بی تھا مگر وہ نیک نانی کے نام سے مشہور تھی۔ وہ لاہور شہر سے کچھ دور گاؤں میں رہتی تھی۔ اسد، آرزو اور فہدان کی آمد پر بہت خوش تھے۔ نیک نانی نیک ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ہنر مند خاتون بھی تھی اور وہ دن رات عبادت اور لوگوں کے بھلائی کے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔

آتے ہی انہوں نے اعلان کیا کہ وہ وسیع پیمانے پر افطاری کا اہتمام کرنا چاہتی ہیں۔ امی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ٹھیک ہے اماں، جیسے آپ کی مرضی۔" امی نے مسکرا کر کہا۔

نیک نانی بہت پیارے مسکرائیں۔ "میں نے اس مقصد کے لیے خوشیوں کا ڈبہ بھی بنایا ہے اور اسے خاص طور پر گاؤں سے لے کر آئی ہوں۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خوشیوں کا ڈبہ؟"

امی حیران ہو گئیں تینوں بچے بھی حیرت سے دیکھنے لگے۔

"ہاں بھئی! یہ دیکھو۔" نیک نانی نے اطمینان سے کہتے ہوئے انہیں ایک درمیانے سائز کا ڈبہ دکھایا جو منی بکس (گلے) کی طرح تھا۔ وہ ڈبہ چاروں طرف سے بند تھا اور اس کے وسط میں ایک چھوٹی سی مستطیل ہوادار جگہ بنائی گئی تھی۔

"کیا اس ڈبے میں خوشیاں ہیں؟" آرزو نے حیرت سے پوچھا۔

نیک نانی پراسرار انداز میں مسکرائیں۔

"ہاں مگر وہ خوشیاں ابھی نظر نہیں آئیں گی۔ عید کے دن نظر آئیں گی۔"

نانی نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیا مطلب نانی؟" اسد نے ناسمجھی سے پوچھا۔

اس ڈبے سے ہم خوشیاں کیسے نکالیں گے۔

فہد نے سوچتے ہوئے کہا۔ اُسے یہ ڈبہ پراسرار سا لگ رہا تھا۔

نیک نانی نے اطمینان سے صوفے سے ٹیک لگالی۔

"اس بار میں نے سوچا ہے کہ ہم یتیم خانے میں یتیم بچوں کے لیے عیدی کا انتظام کریں گے اور ان کے لیے عید کا کھانا بنوائیں گے۔ عید دراصل مسلمانوں کی خوشیوں کا نام ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس خوشی کے تہوار پر اپنے ساتھ ساتھ مستحق اور ضرورت مند لوگوں کا بھی خیال رکھیں۔ اس مقصد کے لیے میں نے کچھ رقم سنبھال کر رکھی ہوئی ہے مگر یہ ایک بڑا کام ہے جس کے لیے وہ رقم ناکافی ہوگی۔ اس لیے میں نے یہ خوشیوں کا ڈبہ

ہوا یا ہے، افطاری میں سارے خاندان والے اور ملنے جلنے والے لوگ آئیں گے اور اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس ڈبے میں یتیم بچوں کے لیے عطیات ڈالیں گے۔ اس رقم سے ہم یتیم بچوں کے لیے عید کی خریداری کریں گے۔" نیک نانی نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ میں افطاری کے انتظامات کی تیاری کرتی ہوں۔"
امی نے مسکرا کر کہا۔

"بچو! تم سب نے بھی میرے ساتھ بہت سے کام کروانے ہیں۔"
نیک نانی نے خوشی سے بھری آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے نانی، ہم تیار ہیں۔"
بچے پُرجوش آواز میں یک زبان ہو کر بولے۔

امی افطاری کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ سارے خاندان والوں، ہمسایوں اور ملنے جلنے والوں کو بلوایا گیا۔ نیک نانی نے سب لوگوں کو خوشیوں کے ڈبے کے مقاصد کے متعلق آگاہ کیا۔ لوگوں نے اس نیک کام کے لیے خوشی خوشی عطیات دیے۔ سب لوگ نیک نانی کے اچھے کاموں سے واقف تھے۔ انہوں نے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جگنو ماموں نے آسٹریلیا سے خطیر رقم بھیجی۔ ہر سو خوشیوں کے ڈبے کی دھوم مچ گئی۔ رات کو نیک نانی نے بچوں کے ساتھ مل کر خوشیوں کا ڈبہ کھولا تو کافی رقم جمع ہو چکی تھی۔ انہوں نے ساری رقم گنی اور سنبھال کر رکھ لی۔

"دیکھا بچو! اتفاق میں برکت ہوتی ہے۔ اب اس رقم سے ہم سب یتیم بچوں کے لیے بہت ساری چیزیں خریدیں گے۔ وسیع پیمانے پر کام کرنے کے لیے اجتماعی کوشش کرنی چاہیے۔" نانی نے کہا۔

بچوں نے نانی کی بات غور سے سنتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اگلے دن نیک نانی امی کے ساتھ بازار گئیں اور انہوں نے عید کی خریداری کی۔ ہر سائز کے کپڑے، جوتے، چوڑیاں اور بے شمار چیزیں خریدیں۔ گھر آ کر انہوں نے بچوں کے ساتھ مل کر بہت سارے پیکٹ بنائے، آرزو نے سب پیکٹوں پر لکھ دیا کہ وہ پیکٹ کتنی عمر کے بچوں کے لیے مناسب ہیں۔

چاند رات کو نیک نانی نے یہ ساری عیدی یتیم خانے میں تقسیم کروا دی۔ یتیم بچوں کے چہروں پر پھیلی خوشی نے نیک نانی کو پھر سے مطمئن اور خوش کر دیا۔

عید کے دن نیک نانی نے بریانی کی دیگیں بھی وہاں تقسیم کیں۔

پیارے بچو! عید سب کے ساتھ مل کر منانی چاہیے اور خوشیوں میں غرباء، مساکین کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ نیک نانی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بچوں کو اچھی باتیں اپنے عمل سے سکھاتی تھی اور بچے بھی ان کو دیکھ کر سب کام خوشی خوشی کرتے تھے۔ یہ تو آغاز تھا ابھی انہوں نے تو ابھی اور بہت کچھ کرنا تھا۔ ☆☆

بقیہ: پُراسرار کتاب

عمر اور فریال کو اس کی امی نے جب غائب دیکھا تو انہیں ڈھونڈتی ہوئی کمرے میں ان کے پیچھے آ گئی۔ اس وقت وہ دونوں کتاب میں سر دیے بیٹھے تھے۔ امی نے آتے ہی ان سے سوال کیا کہ وہ آخر کیا کر رہے ہیں۔ تب انہوں نے روتے ہوئے سارا واقعہ امی کو سنا دیا۔ امی کے تو طوطے ہی اڑ گئے۔ امی نے کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی تو یہ کسی کالے علم کی کتاب معلوم ہو رہی تھی۔ امی نے ایک بار تو اپنا سر ہی پکڑ لیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کیا کریں۔ پھر وہ کتاب لے کر باہر گئی اور ان کے ابو کو تمام بات سمجھائی۔ انہیں پہلے تو بہت غصہ آیا مگر ابھی اس سب کا وقت نہ تھا۔ اس سے پہلے یہ خبیث ان تینوں کی جان لے لیتا ابو نے کتاب سے اس منتر کا توڑ ڈھونڈنا شروع کیا۔ کتاب کے مطابق کوئی بھی منتر الٹا پڑھنے سے اس کا اثر ختم ہو جائے گا۔ ابو نے ایسا ہی کیا۔ جوں جوں ابو منتر پڑھ رہے تھے۔ اس مٹی کے بنے دیو سے بھیانک چیخیں بلند ہو رہی تھی اور ساتھ ساتھ وہ چھوٹا بھی ہو رہا تھا۔ یہ چیخیں اتنی بھیانک تھی کہ سب اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ آخر منتر پورا ہوا اور وہ پوری طرح سے ختم ہو گیا۔

سب اب بھی حیرت کے مارے اپنی جگہوں پر ساکت کھڑے تھے۔ پھر چچی چچا اور ابو نے ان تینوں کو اٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ جہانزیب کے سر میں کیل لگنے سے اسے پانچ ٹانکے لگے۔ محمود اور عرفان کافی بہتر تھے۔ چچا کو بھی جو چوٹیں لگی تھی انہیں بھی مرہم پٹی کی گئی۔ فجر کے وقت جا کر وہ سب گھر واپس آئے۔ ان کے آنے تک فریال، عمر اور ان کی امی ڈرے سہمے گھر کے لاونج میں بیٹھے رہے۔ گھر آتے ہی ابو نے سب سے پہلے اس کتاب سے چھٹکارا پانے کا سوچا اور اسے جلانے کے لیے چولہے پر رکھ کر آگ لگا دی۔ مگر اس منحوس کتاب کو آگ کا ایک شعلہ بھی نہ چھو پا رہا تھا۔ اس کتاب کو کوئی جلا نہ کر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ شخص بھی اسے کچرے میں پھینک کر جا رہا تھا۔ فریال نے یہ بات سب کو بتائی۔ ابو اور چچا اس کتاب کو ان کے علاقے میں موجود ایک بہت پرانے کنوئیں میں پھینک آئے۔ یہ کنواں اب سوکھ چکا تھا اور کسی کے استعمال میں نہ تھا۔

سب عمر اور فریال سے کافی خفا تھے۔ وہ دونوں بھی شرمندہ تھے۔ انہوں نے سب سے معافی مانگی۔ ابو نے انہیں سمجھایا یوں ہی کوئی چیز راستے سے نہیں اٹھانی چاہیے۔ اور کسی سے انتقام لینے کے لیے تو کبھی بھی اس حد تک نہیں جانا چاہیے کہ ہم اگلے کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچیں۔ ان دونوں کو یہ باتیں سمجھ آ چکی تھی۔ ابو اور امی نے بھی چچا اور چچی سے معافی مانگی۔ محمود، عرفان اور جانزیب بھی شرمندہ تھے کہ انہوں نے انہیں اتنا ستایا کہ وہ بدلہ لینے پر آ گئے۔ غلطی ان کی بھی تھی۔ مگر یہ بھیانک رات بھولنے والی نہ تھی۔ ایک اور حیرت کی بات تھی کہ ان کے گھر میں ہونے والے شور شرابے کی آواز آس پاس کے کسی گھر نے بھی نہ سنی تھی۔ یہ واقعی ہی کالے علم کی کتاب تھی۔ ☆☆

مینار پاکستان

فضہ شکیل

"فہد بیٹا! میری کتاب کہاں ہے؟"

اسد اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے فہد کو بلانے لگے۔

"کون سی کتاب ابا؟" فہد صوفے پر بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کو سر اٹھا کر سوال کرتے پھر سے سر جھکا لیا۔ اس کے ہاتھ میں تاریخ کی ایک دلچسپ کتاب تھی۔ فہد کو تاریخ پڑھنے کا شوق تھا۔ کتب بینی کا آغاز اس نے پریوں اور جنوں کی کہانیوں سے کیا تھا لیکن ابا سے ہر وقت تاریخ کے حوالے سن کر دس سال کی عمر سے ہی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔

گزشتہ ایک سال میں ابا کی لائبریری سے اس نے ہر کتاب لینے کی کوشش کی تھی۔

"جو مینار پاکستان کی تاریخ پر تھی۔" اسد اس کے قریب آئے اور اس کے ہاتھ میں موجود کتاب کو دیکھا۔ ان کا بیٹا تاریخ کو سمجھتا تھا مگر کتابیں لے کر ہمیشہ دینا بھول جاتا تھا۔

"وہ ابا۔۔۔ وہ تو ابھی میرے ہاتھ میں ہے۔"

"کیا پڑھ رہے ہو؟" اسد اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

"اسکول میں یوم پاکستان کی تقریب ہے۔ ٹیچر نے کہا تھا تقریر تیار کرو۔ میں اس لیے پس منظر پڑھ رہا ہوں۔"

"ہم۔۔۔ کچھ مشکل تو نہیں؟"

"تھوڑی تھوڑی ہے۔ لیکن میں دو مرتبہ پڑھوں گا تو شاید سمجھ آ جائے۔"

فہد نے ہنستے ہوئے باپ کو جواب دیا۔

"مشکل تھوڑی سے زیادہ ہو جائے تو میرے پاس آ جانا۔"

اسد اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے وہاں سے اٹھ گئے۔

......☆......

اگلے دن فہد جب اسکول پہنچا تو اسے معلوم ہوا آج پہلے تین لیکچر نہیں ہوں گے بلکہ ان کی جگہ آڈیٹوریم میں ایک خاص پروگرام ہے۔

"یوم پاکستان تو ابھی نہیں آیا تو آج کیا ہوگا آڈیٹوریم میں؟"

فہد نے اپنے دوست سے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم، جا کر دیکھتے ہیں۔"

وہاں داخل ہونے کے بعد انہیں معلوم ہوا آج تاریخ پاکستان کے حوالے سے اسکول کے بچوں کے لیے سیمینار ہے۔

سیمینار شروع ہوا تو اسٹیج پر ایک بزرگ خاتون تشریف لائیں۔

ٹیچر نے ان کا تعارف کروایا تو معلوم ہوا وہ آزادی پاکستان دیکھنے والوں میں سے ایک تھی۔

''آزادی کے وقت میری عمر 4 سال تھی۔ ویسے تو ہمارا گاؤں بہت پر امن تھا۔ لیکن ہجرت کا باقاعدہ اعلان ہوا تو بہت سے مسئلے پیش آئے۔ میرے بابا جان تو 1940 میں قرارداد کو روکنے کے لیے کیے گئے ہنگاموں میں شہید ہو گئے تھے۔ میں، میری ماں اور میرا بڑا بھائی۔ ہم تینوں لوگ مقررہ وقت پر ٹرین پر سوار ہوئے تھے۔ لیکن اس سرزمین پر زندہ پہنچنے والی صرف میں تھی۔''

انہوں نے اور بھی باتیں بتائیں۔ کتابوں میں لکھی قربانیوں کی باتیں پڑھنا اور آج کسی چشم دید گواہ کے منہ سے سننا، الگ چیز تھی۔ تمام بچے دل چسپی سے انہیں سنتے رہے۔

☆

فہد اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد اپنے سائنس کے ٹیچر کے پاس ایک سوال پوچھنے کے لیے گیا۔ اس کو زیادہ کتابیں پڑھنے کی اجازت بھی اسی لیے ملی تھی کہ وہ اپنی پڑھائی پر مکمل توجہ دے گا۔

سائنس لیب میں داخل ہونے کے بعد اس کے ٹیچر میز پر جھکے ہوئے تھے۔ ہلکی نیلی روشنی بھی میز سے ابھر رہی تھی۔ جب کہ لیب کی باقی بتیاں بجھی تھی۔

''سر! میں آجاؤں؟''

فہد نے دروازہ کھٹکھٹاتے سر کو مخاطب کیا۔

''آجاؤ کیا ہوا؟'' سر نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

''سر ایک سوال ہے۔ اور۔۔۔ یہ کیا بنا رہے ہیں؟''

''ہاں! یہ ایک خاص چیز ہے، اس سے میں کچھ خاص کرنے والا ہوں۔''

سر کا انداز تھوڑا پر اسرار تھا۔

''کیا میں دیکھ لوں؟''

''آؤ! یہ دیکھو یہ ایک گھڑی ہے۔ میری بنائی ہوئی، اس میں جو وقت، دن اور۔۔۔''

فہد نے تجسس کے ہاتھوں آگے ہو کر خوب صورت گھڑی کو دیکھا اور ہاتھ لگانا چاہا۔

''ارے! ہاتھ نہ لگانا۔''

سر نے اسے ہاتھ لگانے سے منع کیا۔

''اور سر یہ بٹن۔'' فہد نے بٹن کو ہاتھ لگایا۔ کمرے میں نیلی روشنی پھیلنے لگی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے سر؟''

فہد پریشان ہو گیا۔

''تم نے بٹن کو دبا دیا ہے اب ہم کچھ سال پیچھے جا رہے ہیں۔''

سر کا انداز نارمل تھا۔

''سر پلیز مجھے ڈر لگ رہا ہے واپس چلیں۔'' ارد گرد پھیلی روشنی اب اندھیرے میں بدلنے لگی تھی۔

''کوئی بات نہیں، تمہیں تاریخ بہت پسند ہے نا! آؤ اب اس کا سفر کرو۔'' سر اب بھی عام سا رد عمل دے رہے تھے۔

اندھیرا چھٹنے لگا۔ وہ کسی باغ کے باہر موجود تھے۔ سڑک پر کچھ سواریاں چل رہی تھی۔ کچھ تانگے، کچھ گاڑیاں۔

''آؤ پارک کے اندر چلیں، یہ منٹو پارک ہے۔''

''وہ، جہاں قرارداد ہوئی تھی۔''

''ہاں! بالکل لیکن اب تم مینار پاکستان کا پوچھو گے۔'' سر کا انداز شرارتی تھا۔

''نہیں سر، مجھے معلوم ہے وہ 1960 میں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا اور 1968 میں مکمل ہوا۔'' فہد نے فخریہ انداز اپنایا۔

''شاباش! اس کو تعمیر کرنے والوں کو جانتے ہو؟''

''نہیں!''

''اس کے معمار نصر الدین مراد اور عبد الرحمان نیازی تھے۔''

دونوں چلتے چلتے پارک میں داخل ہوئے۔ لوگوں کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ فہد نے اسپیکر سے آتی آواز پر غور کیا۔

''سر یہ قائد کی آواز ہے۔ میں نے دستاویزی فلموں میں سنی ہے۔''

فہد کو اشتیاق ہوا لیکن وہ زیادہ آگے نہیں جا سکتا تھا۔

''دونوں قومیں مختلف ہیں، ان کا کسی طور اتحاد ممکن نہیں۔''

قائد اعظم کی بارعب آواز ہر کسی کے کان میں گونجتی نیا ولولہ ابھار رہی تھی۔ مسلمانوں کے نعرے وقفے وقفے سے گونج رہے تھے۔

''اے کے فضل الحق آ رہے ہیں۔''

سر نے اس کا دھیان سامنے کیا۔

''سر یہ جلسہ دو دن سے چل رہا ہے۔ پھر بھی لوگوں کا جوش و خروش قابل دید ہے۔''

''اچھا! یہ بات مجھے نہیں معلوم تھی۔''

''سر آپ ہمیشہ سائنس ہی پڑھتے رہے ہیں۔'' فہد نے ہلکی آواز میں کہا کہ کہیں سر سن ہی نہ لیں۔

''واپس چلیں۔'' سر نے رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں سر، یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو تھوڑا سا رک جاتے ہیں۔ میں اپنے ہیرو، شیر بنگال اے کے فضل الحق کی آواز بھی سننا چاہتا ہوں۔ آج ان کی زبان سے مسلمانوں کو باقاعدہ معلوم ہونے والا ہے کہ وہ ایک الگ وطن حاصل کر کے رہیں گے۔''

بقیہ صفحہ نمبر: 45

سوا سیر

الطاف حُسین

"الطاف!...ارے الطاف بھائی!..." ایک جانی پہچانی آواز نے ہمیں پکارا۔ ہم پلٹ کر دیکھنے کی حماقت کیے بغیر چلتے رہے۔

"یار!...ٹھہرو تو سہی...میری بات تو سنو۔" وہی آواز دوبارہ ہماری سماعت سے ٹکرائی اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو جناب عبدالحمید ڈھول صاحب اپنی "فٹ بال نما" توند کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ناک کی سیدھ میں کسی گیند کی طرح لڑھکتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ ہمیں پکڑنے کے چکر میں انہیں راستے میں پڑا پتھر دکھائی نہ دیا اور وہ اس سے ٹھوکر کھانے کے نتیجے میں دھڑام سے زمین پر گرے اور سر سے پاؤں تک "مکمل سجدہ ریز" ہو گئے۔ انہوں نے لیٹے لیٹے دائیں ہاتھ سے ماتھے پر ابھر آنے والے "آلو نما" گومڑ کو اچھی طرح ٹٹول کر اس کی جسامت کا اندازہ کیا اور اس کے بعد اٹھ کر بیٹھے اور پھر چند لمبے لمبے سانس لینے کے بعد اپنی "فٹ بال نما" توند کو سنبھالتے ہوئے "اونٹ اسٹائل" میں کھڑے ہو کر انتہائی غصے کے عالم میں پتھر کو اپنے مخصوص انداز میں ٹھوکر مارتے ہوئے ایک عدد بددعا نشر کی۔

"یار! اگر تم میری صدا پر رک جاتے تو میرے ماتھے پر یہ نہ بنتا۔" انہوں نے اپنے ماتھے پر ابھرے ہوئے گومڑ کو ایک بار پھر ٹٹولتے ہوئے ناگواری کا اظہار کیا۔

"سوری سر! غلطی ہو گئی۔ میں آپ کی آواز پر دھیان نہیں دے سکا۔" ہم نے معذرت کرتے ہوئے منہ پھلا لیا۔

"اوہ! میرا دوست تو ناراض ہو گیا۔ دیکھو دوستوں سے اس طرح ناراض نہیں ہوا کرتے اور سناؤ کیسے ہو؟" انہوں نے ہمارا رویہ بدلتا دیکھ کر اپنے انداز گفتگو میں فوری طور پر تبدیلی کی اور ہمیں اپنے بڑے بڑے بازوؤں میں جکڑتے ہوئے پیار بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔

"ٹھیک ہوں۔" ہمارا جواب خاصا مختصر تھا۔

''سنا ہے آج دادا جان نے تم پر کچھ ''عنایت'' کی ہے!... تو پھر کیا پروگرام ہے تمہارا؟'' انہوں نے ہمیں خاموش دیکھ کر للچائی ہوئی نظروں سے ہماری جیب کی طرف دیکھا اور پھر دل کی بات زبان پر لے آئے۔ ان کی تمدیدی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم نے فوری طور پر اپنی جیب پر ہاتھ کی گرفت کچھ اور مضبوط کر لی۔

''پروگرام؟ کیسا پروگرام؟'' ہم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''پیارے! اب اتنا بھی انجان نہ بنو کہ تمہیں دیکھ کر انجان بھی شرما جائیں... تم نے پچھلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو پیر کے روز رات آٹھ بج کر چونتیس منٹ پر نیم کے درخت کے نیچے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار جب دادا جان سے ''وصولی'' ہوگی تو تمہاری دعوت کروں گا، تمہیں یاد آیا؟'' انہوں نے ہمیں جھنجھوڑتے ہوئے وعدہ یاد دلایا اور ہم ان کی ''ہضم خور'' یادداشت پر کانپ کر رہ گئے۔

''کم بخت! کتنا ذہین ہے۔ کھانے پینے کے معاملات ذرا نہیں بھولتا لیکن اسکول کا سبق روز بھول جاتا ہے اور روز مار کھاتا ہے۔'' ہم نے خود کلامی کی۔

''کیا سوچ رہے ہو جن! مجھے وقت بتاؤ وقت۔'' انہوں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا ''تمہیں پتا ہے کہ وہ شخص منافق ہوتا ہے جو کسی سے وعدہ کر کے پورا نہ کرے۔'' انہوں نے ہمارے جذبات سے کھیلتے ہوئے ایک اور ''تھیوریٹکل'' حملہ کیا۔

''اگر میں آج یہ کام نہ کروں تو؟'' ہم نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تو پھر مجھے تمہیں مشروط طور پر مومن بنانا پڑے گا۔'' انہوں نے یہ کہتے ہوئے اپنے بازوؤں کی گرفت کچھ اور مضبوط کر دی۔ ہم ٹھہرے سنگل پسلی کے ''پہلوان''... ان کا یہ جبر برداشت نہ کر سکے اور ہماری چیخیں بول گئیں۔

''اللہ رحم کیجیے! ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں'' ہم نے اپنی ہڈی پسلی ایک ہوتی دیکھی تو فوراً مشروط طور پر ''تائب'' ہو گئے۔

''ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ تم ہو تو خاندانی سعادت مند لیکن کبھی کبھار شرارت پر اتر آتے ہو۔ بات مانتے ہو لیکن ذرا دیر سے۔'' عبدالحمید ڈھول نے مسکراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ہمیں اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

''کل کا پروگرام کیسا رہے گا۔'' ہم لمبے لمبے سانس لینے کے بعد بولے۔

''نہیں، ہرگز نہیں خبردار جو تم نے کل کا نام لیا۔ ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ کبھی آج کا کام کل پر نہ ڈالو، کل کبھی نہیں آتی۔ جو قومیں آج کا کام آج نہیں کرتیں وہ کبھی ترقی نہیں کرتی اور ہم سچے دل سے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ ہمیں گھورتے ہوئے بولے۔

''توند میں!'' ہم نے ان کے چہرے اور پھر ان کی پھولی ہوئی توند کو بغور دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں جملہ مکمل کیا۔

''جواب دینے میں اتنی دیر کیوں لگا رہے ہو؟'' وہ بڑی بے قراری سے بولے۔

''ٹھیک ہے تمہارا آج رات کا کھانا میری طرف سے۔'' ہم نے تھک ہار کر ہتھیار ڈال دیے۔

''رات کا نہیں، دوپہر کا میں ٹھیک بارہ بجے تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔ کھانا گھر میں نہیں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔'' وہ اپنی توند پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

''اگر تم نے ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی تو'' ان کا جملہ ادھورا ہونے کے باوجود ہمیں مکمل محسوس ہوا۔

''اچھا یار! ٹھیک ہے ٹھیک ہے، آ جانا بارہ بجے۔'' ہم نے نہ چاہتے ہوئے بھی حامی بھر لی۔

''یوں نہیں ہنس کر کہو۔'' انہوں نے جلتی پر اور تیل ڈالا۔

''اچھا! ٹھیک ہے۔ آپ بارہ بجے میرے گھر تشریف لے آنا۔'' ہم نے دانت پیستے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی تو اس لمحہ ہمیں یوں لگا جیسے ہم رو رہے ہیں۔

''میں چلتا ہوں تم جس کام سے جا رہے تھے جاؤ۔ لیکن دیر نہیں کرنا جلدی گھر آ جانا۔'' انہوں نے زبردستی ہاتھ ملایا اور جدھر سے آئے تھے اسی طرف چل دیے۔

...☆...

وال کلاک نے جوں ہی دن کے گیارہ بجے کا اعلان کیا ہمارے گھر کا دروازہ ڈھول کی طرز پر بجایا جانے لگا۔ ہم سمجھ گئے کہ اذیت ناک گھڑی وقت کی گھڑی سے ایک گھنٹہ پہلے ہی آ گئی ہے۔ قبل اس کے ہم بچاؤ کی کوئی تدبیر کرتے ہمارے بھائی گلو نے دروازہ کھول کر ''گل کھلا دیا۔'' وہ بڑے فخر سے عبدالحمید ڈھول کے ہمراہ ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔

''السلام علیکم سر!'' عبدالحمید ڈھول نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''وعلیکم السلام!'' ہم نے درد دل چھپاتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور ساتھ ہی انہیں احساس دلانے کی غرض سے وال کلاک کی طرف دیکھا لیکن انہوں نے ہمارے اشارے کا کوئی مطلب نہ لیا۔

''کیسا لگ رہا ہوں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''لمبے کرتے میں ملبوس، پاؤں میں کالے رنگ کی پشاوری چپل بائیں ہاتھ میں سرخ رنگ کا ''عاشقی'' رومال اور سر پر چترالی ٹوپی برائے گنج پوشی، حلیہ تو آپ کا خاصا پرکشش ہے۔'' ہم ان کے ''رن آؤٹ'' پر رننگ کمنٹری کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

''یہ ''گیٹ اپ'' میں نے خصوصی طور پر تمہاری دعوت میں شرکت کے لیے منتخب کیا ہے۔'' وہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے بولے:

''بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گے؟''

''تشریف رکھیے جناب!'' ہم نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اگلے لمحہ صوفہ ان کے

بوجھ تلے دب گیا۔

''ابھی تو گیارہ'' اب کی بار ہم نے لب کشائی کرتے ہوئے انہیں دوبارہ وقت کا احساس دلانا چاہا، مگر وہ نظر انداز کر گئے ہماری بات کو۔

☆......☆

جس وقت ہم گھر سے تیار ہو کر نکلے اس وقت ہماری گھڑی اور صورت دونوں پر ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ گھر سے ریسٹورنٹ تک کا سفر نہایت خاموشی سے طے کیا جا رہا تھا۔ دونوں طرف مکمل خاموشی تھی۔

''کیا ہوا ہمارے یار کو؟ آج بہت چپ چپ سا دکھائی دے رہا ہے کچھ بولتا ہی نہیں'' چلتے چلتے اچانک ان کے لب ہلے۔

''کوئی بات نہیں، تمہیں خوامخواہ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ویسے بھی وقت بے وقت بولنا میری عادت نہیں۔'' ہم نے کہا۔

''اچھی بات ہے! بھئی بہت اچھی بات ہے! خرچے سے تو پریشان نہیں ہو؟'' انہوں نے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے ویسے بھی بھوکے کو کھلانا ثواب کا کام ہے۔'' ہم نے جوابی وار کیا اور اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہوئے اور ایک کونے میں موجود خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔

''یس سر!'' ہمارے بیٹھتے ہی ویٹر چراغ کے جن کی طرح نازل ہو گیا۔

''ارے ان سے نہیں۔'' انہوں نے پہلے معنی خیز نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر ویٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

''ہم سے آرڈر لیجیے۔''

''آج آپ کے لذیذ ریسٹورنٹ میں کیا کیا پکایا گیا ہے؟'' ویٹر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں ویٹر نے میز پر دائیں طرف رکھا ''مینو چارٹ'' اٹھا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''پہلے تم فرائی گوشت، ایک درجن کباب اور دس بارہ روٹیاں لے آؤ۔''

انہوں نے بڑے غور سے ''مینو چارٹ'' دیکھنے کے بعد آرڈر دیا۔

''سر! پہلے سے کیا مراد ہے؟'' ویٹر نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

''عقل مند آدمی! قسطوں میں کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' انہوں نے وضاحت کی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مطلوبہ چیزیں میز پر لا کر رکھ دیں۔ موصوف نے ہمیں کھانے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھانے پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً سب کچھ ''صاف'' کر دیا۔

''آؤؤؤؤؤک!!'' پانی پینے کے بعد انہوں نے عجیب سے انداز میں ڈکار لی۔

آس پاس بیٹھے لوگوں نے اس ''عجوبہ'' کو پہلے حیرت سے دیکھا اور پھر سب نے زوردار قہقہے لگائے۔ لیکن عبدالحمید ڈھول پر اس بات کا ذرہ برابر ''اثر'' نہیں ہوا۔ وہ بھوکی چیل کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے شاید ان کی نظریں اپنے ویٹر کو تلاش کر رہی تھی۔ ویٹر کو دیکھتے ہی انہوں نے زوردار سیٹی بجا کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''جی سر! اور کچھ!'' ویٹر ہماری میز کے قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں بولا۔

ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اب صرف کولڈ ڈرنک کا تقاضا کیا جائے گا لیکن ہماری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب عبدالحمید ڈھول نے ویٹر کو ایک عدد چکن بریانی اور کوفتے لانے کا نیا آرڈر دیا۔ ہم نے ویٹر کو اشاروں ہی اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کہہ دے آج یہ دونوں چیزیں ''مینو چارٹ'' میں تو شامل ہیں لیکن پکائی نہیں گئیں لیکن وہ ظالم بھی لگتا تھا عبدالحمید ڈھول سے ملا ہوا تھا۔ ہمارے سینے پر مونگ دلتے ہوئے مسکرا کر بولا:

''ابھی لایا سر!'' ہم دانت پیستے رہ گئے۔ کمزور اور مجبور آدمی کے پاس ایسے حالات میں پیسنے کے لیے یہی تو ایک چیز ہوتی ہے کیونکہ مالی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ دوسری چیزوں کو پیسنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

کچھ دیر بعد ویٹر نے جیسے ہی ''مال'' میز پر رکھا موصوف نے ''مال مفت دل بے رحم'' کی طرح پہلے چکن بریانی پر جارحیت کی پالیسی کے تحت حملہ کیا اور اس کے بعد نہایت بے دردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوفتوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ہم نے دل ہی دل میں حساب لگایا تو ریسٹورنٹ کے ''مینو چارٹ'' کے مطابق بل سترہ سو روپے سے تجاوز کر چکا تھا، اور ہمارے پاس صرف دو ہزار روپے تھے اگر عبدالحمید ڈھول اس پر ''بس'' کر دیتے تو ہماری عزت بچ سکتی تھی لیکن ان کے مزید کچھ ''ٹھونسنے'' کا ارادہ ہمارے لیے ''ریڈی میڈ'' رسوائی کا باعث بن سکتا تھا۔

''کھاؤ نا یار! تم نے کیوں ہاتھ روک لیا ہے؟ کھاؤ پیو مزے اڑاؤ! اسی کا نام زندگی ہے!'' وہ کھانے کے دوران پہلی بار ہماری طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''تمہارے ہاتھ سے کچھ بچ گیا۔ تو میں بھی زہر مار کر لوں گا۔'' ہمارے لہجے میں طنز کی جھلک نمایاں تھا۔

''ارے ناراض نہ ہو تم یہ کوفتے کھاؤ، میں کچھ اور منگا لیتا ہوں، ویٹر...... ویٹر! بھئی ذرا ادھر آنا۔'' انہوں نے ایک عدد کوفتہ ہمارے طرف بڑھاتے ہوئے ویٹر کو بلند آواز سے پکارا اور ہمارا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہی ہو رہا تھا جس کا ہمیں ڈر تھا۔

''یس سر!'' ویٹر نے شرارت بھرے انداز میں پہلے ہمیں دیکھا اور پھر عبدالحمید ڈھول کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا'' کچھ اور لاؤں سر؟''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں جاؤ دوڑ کر ایک عدد چکن بریانی اور لے آؤ۔ تمہارے

ریسٹورنٹ کی بریانی بڑی ذائقے دار ہے۔ اور باقی اس کے بعد بتاؤں گا۔'' انہوں نے نیا آرڈر دیا اور ویٹر ہماری طرف معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے مسکرایا اور پھر تیزی سے ''سپلائی کاؤنٹر'' کی طرف بھاگا۔

''یار اب بس بھی کرو۔ انگلی پکڑنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم پورا ہاتھ ہی قابو کرلو۔'' ویٹر کے جانے کے بعد ہم نے حمید ڈھول کو غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن وہ شاید اس نام کی کسی چیز کو جانتے ہی نہ تھے اور ہم نے سن رکھا تھا کہ موٹے آدمی میں غیرت کو جاگنے میں خاصا وقت لگتا ہے کیونکہ وہ بھاری بھرکم جسم میں خون کی طرح گردش کرنے کے بعد دماغ تک پہنچتی ہے اور عبدالحمید ڈھول کی غیرت کے جاگنے کا وقت ابھی دور بلکہ بہت دور تھا۔

چکن بریانی آتے ہی عبدالحمید ڈھول نے اس پر تازہ دم حملہ کردیا اور سات منٹ میں سیکنڈ بعد صاف پلیٹ ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔

''سر! کچھ اور لاؤں؟'' ویٹر بغیر آواز دیے ہی ہماری میز تک آگیا اور ہماری طرف ڈھٹائی سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

ہمارا دل آنے والے بل کی وجہ سے سخت پریشان تھا اور وہ کم بخت ویٹر بھی جان گیا تھا کہ پیٹو سرکار ہمیں گھیر کر یہاں تک لے آئی ہے۔

''ویٹر! ایک ڈیڑھ لیٹر والی سیون اپ لے آؤ۔'' ظالم آدمی نے نیا آرڈر دے دیا۔

''چھوٹی والی بوتل لے آؤ۔'' اب کی بار ہم سے برداشت نہ ہوسکا۔

''الطاف یار! چھوٹی بوتل سے میرا کیا بنے گا۔'' عبدالحمید ڈھول منہ بسورتے ہوئے بولے۔

''ویٹر بھائی! چھوٹی بوتل ہی لے آؤ میرے صاحب ناراض ہو رہے ہیں۔'' انہوں نے ویٹر سے کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

اردگرد بیٹھے لوگوں جو کافی دیر سے خود بھی کھانا کھا رہے تھے اور حمید ڈھول کے کھانے کے انداز سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ اب ان کے پینے کے انداز پر قہقہے لگا رہے تھے۔ اُدھر قہقہے لگ رہے تھے اور اِدھر ہم شرم سے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔

''ویٹر ویٹر!'' انہوں نے گنگناتے ہوئے ویٹر کو پکارا۔

''یس سر! اور کیا پیش کروں؟'' ویٹر نے شرارتی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے پوچھا۔

☆

''اب صرف بل لاؤ مزید کچھ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ہم نے ویٹر کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور وہ خاموشی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد بل ہماری میز پر موجود تھا... ہم نے بل پر درج رقم دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا جس نے آج ہمیں بھرے ریسٹورنٹ میں رسوا ہونے سے بچالیا تھا! بل دو ہزار روپے تھا۔ ہم نے جیب سے ہزار، ہزار کے دو نوٹ نکال کر دھڑکتے دل کے ساتھ ٹرے میں رکھ دیا... ویٹر ٹرے اٹھا کر لے گیا۔ اس کے بعد ہم عبدالحمید ڈھول کو ساتھ لے کر ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔

ابھی بمشکل چند گز ہی چلے تھے کہ اچانک عبدالحمید ڈھول کا چہرہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگا۔

''کیا ہوا؟'' ان کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر ہم نے پوچھا۔

''و...... وہ...... م...... میرے...... پ...... پیٹ...... میں کک...... کچھ ہو رہا ہے بھیا!'' انہوں نے اپنی ''فٹ بال نما'' توند کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور منہ بسورتے ہوئے پیٹ میں ''کچھ'' ہونے کی اطلاع دی لیکن ہم نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

''الطاف بھائی!...... م...... م...... میرے...... پ...... پیٹ میں واقعی...... کک...... کک...... کچھ ہے۔'' انہوں نے ہمیں لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے دیکھ کر دوبارہ احتجاج کیا۔

''کچھ'' ہم نے لفظ ''کچھ'' پر خاصا زور دیتے ہوئے کہا:

''یار عبدالحمید ڈھول! تمہارے منہ سے ''کچھ'' کا لفظ سنتے ہوئے ہمیں کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے...... تمہارے پیٹ میں ''کچھ'' نہیں بلکہ ''بہت کچھ'' ہے...... قرائی گوشت، ایک درجن کباب، دس بارہ روٹیاں، چکن بریانی، کوفتے اور پھر چکن بریانی اور اس کے بعد ''سیون اپ'' موجود ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے پیٹ میں صرف ''کچھ'' ہے۔ یار! کچھ تو خدا کا خوف کرو۔''

''میں کہہ رہا ہوں نا کہ میرے پیٹ میں ''کچھ'' ہے اور تم میرا مذاق اڑا رہے ہو... تمہارے اس احمقانہ رویے سے مجھے سخت قسم کا ''شاک'' پہنچا ہے!!'' وہ تکلیف اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ منہ بسورتے ہوئے بولے۔

''اُف، ہائے! اماں جی! میرے پیٹ میں بہت سخت درد ہو رہا ہے'' درد سے بلبلاتے ہوئے ان کی ''ہائے'' پر خاصا زور پڑ رہا تھا۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ''ہائے'' ہم پر آپڑے اور'' ہم اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکے اور فوراً ایک رکشے والے کو روکا اور ڈرائیور کی مدد سے ان کو اٹھا کر رکشے میں لادا اور خود ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے کیونکہ پچھلی سیٹ پر ہمارے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔

خدا خدا کرکے ہم عبدالحمید ڈھول کے گھر پہنچے۔ ڈرائیور کی مدد سے ہم نے انہیں رکشے سے اتارا اس کے بعد ہم دونوں نے ان کا ایک ایک ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے ان کے گھر کے دروازے تک لے آئے۔ ہم نے اس ''کارِ خیر'' پر رکشہ ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے کرایہ دیا اور اس کے جانے کے بعد عبدالحمید ڈھول کے گھر کے دروازے پر ''ہنگامی'' دستک دی چند لمحوں بعد عبدالحمید ڈھول کے ابا جان نے دروازہ کھولا۔

”ہائے کیا ہو گیا میرے چاند کو؟“ وہ اپنے بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے۔

”خالو جان! آج آپ کا چاند کچھ زیادہ ہی چمک گیا ہے! اور وہ بھی دن دہاڑے۔“ ہم نے طنز بھرے انداز میں عبدالحمید ڈھول کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”آج آپ کے چاند نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے۔“

”کم بخت! کو میں نے کئی بار سمجھایا ہے کہ کم کھایا کر کسی دن کسی کی نظر لگ گئی تو گلاب کے پھول کی طرح مرجھا جائے گا، لیکن یہ کم بخت کسی کی سنتا ہی کب ہے۔“ خالو جان نے عبدالحمید ڈھول کو دو چتر جماتے ہوئے غصے کا ”عملی“ مظاہرہ کیا اور موصوف جواب میں اشکوں سے منہ دھونے لگے۔

”چپ کر رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اور پھر ہمیں مخاطب کرتے ہوئے بولے ”الطاف بیٹے! دوڑ کر جاؤ چوک والے حکیم صاحب سے ہاضمے کا چورن لے آؤ۔“ خالو جان بولے۔

”خالو جان! آپ بالکل پریشان نہ ہوں میں انہیں ابھی ”ٹھیک“ کر کے لے آتا ہوں۔“ ہم نے کہا اور اس سے پہلے وہ کچھ کہتے ہم نے عبدالحمید ڈھول کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل دیے کس طرف؟ اس سوال کا جواب عبدالحمید ڈھول نہیں جانتا تھا۔

☆

”تم یہاں بیٹھ جاؤ میں تمہاری تکلیف دور کرنے کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔“ ہم نے عبدالحمید ڈھول کو پارک کے بینچ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”ذرا جلدی آنا پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ انہوں نے رو دینے والے انداز میں ہماری طرف دیکھا۔

”تم فکر نہ کرو میں یوں گیا اور یوں آیا۔“ ہم نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور بھاگم بھاگ گھر پہنچے اپنے کتے ”نامی“ کو ساتھ لیا اور فوری طور پر پارک پہنچے۔ دیکھا تو موصوف مقررہ بینچ سے غائب تھے۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا تو موصوف دائیں کروٹ لیٹے ”آرام“ فرما رہے تھے اور وہ بھی کرکٹ کی پچ پر۔ انہوں نے ہمارے جانے کے بعد جگہ تبدیل کر لی تھی۔

ہم نے ”ٹارگٹ“ کی طرف اشارہ کر کے نامی کی زنجیر کھول دی! جیسے ہی نامی تیزی سے عبدالحمید ڈھول کی طرف دوڑا ہم ”ڈراپ سین“ دیکھنے کے لیے ایک درخت کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

نامی نے عبدالحمید ڈھول کے قریب جا کر پہلے انہیں سونگھا اور پھر زور سے بھونک کر ”شکار“ کے زندہ ہونے کا ”تصدیقی سگنل“ دیا عبدالحمید ڈھول نے کتے کی آواز سن کر ہنگامی طور پر ”قیلولہ“ موقوف کرتے ہوئے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ ایک خوف ناک شکل کتے کو سر پر موجود پا کر انہوں نے بھیانک چیخ ماری اور اپنی ”فٹ بال نما“ توند کو سنبھالتے ہوئے جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ب......ب......بچاؤؤؤؤؤ......خدا کے لیے......م......م......مجھے ب......بچاؤؤؤؤؤؤؤؤ......یہ کتا مجھے کھا جائے گا!“ انہوں نے پہلے چیخ چیخ کر مدد طلب کی اور پھر خوف بھرے انداز میں ایک طرف دوڑنے لگے.. نامی مسلسل ان کے تعاقب میں تھا!!!

عبدالحمید ڈھول اور نامی کی یہ دوڑ اس قدر دلچسپ تھی ہم ”خرچے“ کا غم ایک پل میں بھول گئے اور ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور ادھر نامی اپنے ”شکار“ سے ”کھیلنے“ میں مصروف تھا۔ اس نے دوڑا دوڑا کر ”صاحب بہادر“ کا برا حال کر دیا تھا۔ تقریباً بیس منٹ تک مسلسل دوڑنے کے بعد عبدالحمید ڈھول تھک کر پارک کی ہری ہری گھاس پر گر گئے۔ اور نامی بھی ان سے چند قدم دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ”شکار“ اور شکاری دونوں لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عبدالحمید ڈھول کے پاس پہنچے، وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑے تھے۔

”سرکار! لیجیے ہم آپ کے پیٹ کا درد دور کرنے کی دوا لے آئے ہیں۔“ ہم نے جیب سے ”ڈکار چورن“ کی ایک پڑیا نکالتے ہوئے انہیں ”خوشخبری“ سنائی.. انہوں نے ہماری آواز سن کر دائیں آنکھ کھول کر ہمیں ”ایک آنکھ سے“ دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولے ”کیا وہ چلا گیا ہے؟“

”وہ کون؟“ ہم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”ارے وہی تمہارا سرمئی رنگ والا کتا نامی جسے تم نے ہم پر چھوڑا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی دوسری آنکھ بھی کھول دی۔

”وہ سامنے بیٹھا ہے اور تمہاری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔“ ہم نے نامی کی موجودگی کی تصدیق کی۔ ”لو یہ چورن کھاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی اور اس کے بعد ہم یہاں سے نکل چلیں گے“ ہم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے چورن کی پڑیا ان کے دائیں ہاتھ میں تھما دی۔

”الطاف! اب مجھے کسی چورن کی ضرورت نہیں میرے پیٹ کا درد بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔“ انہوں نے چورن کی پڑیا ہمیں دیتے ہوئے ”انکشاف“ کیا اور ہم دل ہی دل میں مسکرا دیے! جو کچھ ہوا تھا ہماری سوچ کے عین مطابق ہوا تھا، کیونکہ ہم جانتے تھے کہ دو بلائیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں تھی! نامی کے ہوتے ہوئے پیٹ کے درد کی کیا مجال تھی کہ وہ ہمارے یار عبدالحمید ڈھول کو تنگ کرتا۔ اس واقعہ کے بعد عبدالحمید ڈھول نے ”کھانے“ کی غرض سے ہمارے جیسے ”مفت کے مرغے“ پھنسانے سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔ پہلے وہ صرف کھانے کے لیے جیتے تھے اور اب سنا ہے کہ وہ صرف جینے کے لیے کھاتے ہیں۔ ☆

روزہ کا مطلب

سمیعہ علی میمن

''السلام علیکم دادا!'' جان بیٹھک میں داخل ہوتے ہی بچوں نے ایک ساتھ سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بچو! تم سب کو جلدی میرا پیغام مل گیا۔'' دادا جان عفان، معاذ اور ارفع کو دیکھ کر خوشی سے بولے۔

''جی، دادا جان! ہم سب کو جیسے ہی امی نے بتایا کہ دادا جان بلا رہے ہیں تو ہم جلدی سے آپ کے پاس چلے آئے۔'' عفان، معاذ اور ارفع تینوں نے خوشی سے چہکتے ہوئے بتایا۔

''یہ بات تو پھر آپ لوگوں کی مجھ سے محبت کی علامت ہے، پھر آپ کتنی محبت کرتے ہیں اپنے دادا جان سے؟'' دادا جان نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو تینوں پرجوش انداز میں بولے۔

''ہمیں اپنے دادا جان سے بہت بہت محبت ہے اس لئے وہ ہمیں جب کبھی بھی بلائیں گے ہم ان کے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کو ہم سے کتنی محبت ہے؟''

''مجھے بھی اپنے بچوں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی انہیں ہم سے یا پھر اس سے بھی زیادہ۔'' دادا جان کی بات سن کر تینوں خوش ہوئے اور اس خوشی کے ماحول میں ارفع نے دادا جان سے پہلا سوال کیا۔

''ویسے دادا جان! آپ نے ہمیں رات کے وقت یہاں اکٹھا کیوں کیا ہے؟ کیا آپ ہمیں آج بھی کوئی کہانی سنانے والے ہیں؟''

''ہاں، بیٹا! کہانی تو نہیں مگر ایک بات بتانے والا ہوں، رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے نا، صبح پہلا روزہ رکھنا ہے اور کل تم تینوں کا پہلا روزہ ہوگا نا؟'' دادا جان نے بات کرتے ہوئے رک کر تینوں بچوں سے پوچھا تو تینوں یک زبان بولے۔

''جی، دادا جان! اور ہم اپنا پہلا روزہ رکھنے کے لئے بڑے پرجوش ہیں۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے بھئی! ویسے آپ لوگوں کو پتا ہے روزہ کا مطلب کیا ہے؟'' دادا جان نے تینوں کے جوش کو سراہتے ہوئے ایک بار پھر تینوں سے سوال پوچھا۔

''جی، دادا جان! روزہ اسے کہتے ہیں جس میں ہم صبح فجر سے پہلے اٹھ کر سحری کرتے ہیں اور سارا دن بھوکا پیاسا رہ کر مغرب کے وقت افطار کرتے ہیں، پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور تلاوت بھی کرتے ہیں۔'' تینوں بچوں نے پھر سے ایک ساتھ جواب دیا۔

''اور؟'' دادا جان کے اور نے ان تینوں کو حیران کیا۔

''اور کیا دادا جان؟''

''اور یہ کہ روزے کا مطلب کیا ہے؟'' دادا جان کے بات دہرانے پر تینوں نے ہار مانتے ہوئے دادا جان سے کہا۔

''پتا نہیں، آپ بتائیں۔''

اللہ پاک روزہ کے متعلق قرآن پاک فرماتا ہے:

''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔ تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔ (سورۃ البقرہ 183)

''اس میں روزہ کا مطلب'' پرہیزگاری بتایا گیا ہے۔ دادا جان کی بات سن کر عفان کے ننھے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔

''دادا جان! پرہیزگاری کا مطلب کیا ہے؟'' عفان کی بات سن کر معاذ اس کی کم عقلی پر افسوس کرنے لگا۔

دادا جان مسکرائے اور بہت پیار سے تینوں بچوں کو بتانے لگے۔

''جب انسان کے دل میں خوف الٰہی ہو تو وہ گناہ کرنے سے رک جاتا ہے۔ نہیں کرتا۔ وہ جب بھی گناہ کرنے لگتا ہے تو اس کو یہ ہی خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس طرح وہ ہر گناہ سے بچا رہتا ہے اور یہ کہ خوف الٰہی سے ہر برے کام سے بچے رہنے کو پرہیزگاری کہتے ہیں۔ یعنی ہر ایسے کام سے رک جانا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہو اور روزہ رکھ کر اللہ کی رضا کے لیے تو ہم ان کاموں سے بھی رُکتے ہیں جو عام روزمرہ کے معمولات میں کرتے ہیں۔ جیسے کھانا کھانا پانی پینا۔ تو پیارے بچو! آپ وعدہ کرو کے روزہ رکھ کر کوئی بھی ایسا کام نہیں کرو گے جس سے گناہ ملے اور اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہو۔'' دادا جان نے اپنی بات کے اختتام پر تینوں بچوں سے وعدہ لیا تو تینوں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''جی، دادا جان! ہم کوشش کریں گے کہ ایسے کاموں سے دور رہیں۔''

''شاباش میرے پیارے بچو! اب جا کر سو جاؤ صبح سحری کے لئے بھی اٹھنا ہے نا۔'' دادا کی ہدایت سن کر تینوں بچے سونے کے لئے چلے گئے۔

☆......☆......☆

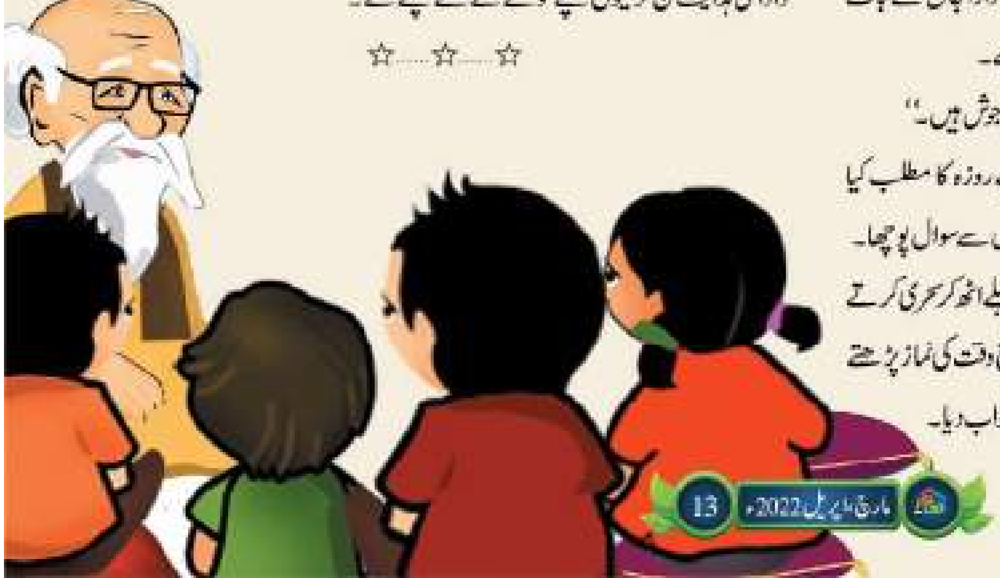

بھوت سے ملاقات

مہوش اسد شیخ

کتاب پڑھتے پڑھتے آنکھیں کچھ بوجھل ہونے لگیں تو سر اٹھا کر سامنے دیوار گیر گھڑیال پہ نگاہ ڈالی۔ رات کے دو بج چکے تھے۔

''اوہ! اتنا وقت ہو گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔''

میں نے کتاب ایک طرف رکھ کر ہاتھ بڑھا کر لائٹ کا سوئچ آف کر دیا۔ سونے کے لیے تکیہ سیدھا کیا اور درود یوار کو شب بخیر کہتے ہوئے لیٹ گئی۔

مطالعہ کے دوران بوجھل ہوتی آنکھوں سے نیند یکدم کوسوں دور چلی گئی۔ لاکھ کوشش کے باوجود نیند لوٹ کر نہ آئی۔ کروٹ بدلتے بدلتے بدن دکھنے لگا۔ اسی اثنا میں مجھے پیاس کا احساس ہوا۔

''کیا مصیبت ہے یار!''

میں بیزاری سے خودکلامی کرتی اٹھ بیٹھی۔

پلنگ سے پاؤں لٹکائے جوتا پہنتے ہی لگی تھی کہ چھت پر کسی کی موجودگی کے احساس سے میرے کان کھڑے ہو گئے۔

''چور......''

پہلا خیال مجھے یہی آیا۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

میں نے بدحواسی کے عالم میں کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ وہاں ایسی کوئی قیمتی شے نہ تھی جسے چوروں کی نگاہ سے اوجھل کرنا ضروری تھا۔

میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔

ایک بار پھر نگاہ دوڑائی جو کہ ناکام لوٹ آئی کہ وہاں ایسا بھی کچھ نہ تھا جسے چوروں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا۔

باقی سب کو بھی چوکنا کرنا چاہیے۔ دوسرا خیال کوندا۔

میں نے ہراساں نگاہوں سے دروازے کی سمت دیکھا۔ ''میرے باہر نکلتے ہی چور نے مجھ پر پستول تان لیا تو! نہیں...... میں باہر نہیں جاسکتی۔''

میں زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے بستر میں دبک کر بیٹھ گئی۔

طویل جان لیوا انتظار کے بعد بھی جب چور نیچے نہیں آیا تو مجھے اپنے خیال کی تردید کرنا پڑی۔

''اوپر چھت پر کون ہے، یہ آوازیں کیسی ہیں؟''

میں سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگی۔

''بھوت''

بہت سوچنے کے بعد دل و دماغ نے متفقہ فیصلہ دیا۔ بھوت کے خیال سے ہی ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ ایسے کئی واقعات اور کہانیاں یاد آ کر رہ گئیں جن میں رات کو چھت سے آوازیں آتی تھی۔

''یا اللہ! ان بھوتوں کو ہماری ہی چھت ملی تھی بھنگڑا ڈالنے کے لئے۔''

آوازیں تیز تر ہو چکی تھیں، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بھوتوں کی ٹیم فٹ بال کھیل رہی ہے، قدموں کی آواز کے ساتھ چیزوں کے ادھر ادھر لڑھکنے کی آواز بھی شامل ہو چکی تھی۔

میں نے آنکھیں میچ کر چادر سر تک تان لی، میرے لب تیزی سے ہلنے لگے جتنی دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں، اپنے گرد آیت الکرسی پڑھ کر حصار باندھ لیا کہ معلوم تھا کڑے وقت میں یہی حصار کام آئے گا۔ مضبوط در و دیوار بھی اس مخلوق کی راہ نہیں روک سکتے۔ یوں ہی حفاظتی دعائیں پڑھتے پڑھتے جانے کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی۔ صبح سب کو رات کا قصہ سنانے کا ارادہ باندھا تو دل میں وسوسے نے جنم لے لیا کہ کہیں بھوت صاحبان برا نہ منا جائیں سو خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

اس خاموشی کے سبب پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہے دوپہر تک حالت خاصی ابتر ہو چکی تھی۔ میں نے دادی کے کمرے کا رخ کیا۔

''السلام علیکم!''

کمرے میں داخل ہوتے ہی با آواز بلند سلام کیا پھر ان کے قدموں میں جگہ بنا کر بیٹھ گئی۔

''وعلیکم السلام!''

انہوں نے چشمے کے پیچھے سے مجھے گھورا کیونکہ اب میں ان کے پیر دبا رہی تھی اور اس صورت حال کو ہضم کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔

''دادی جان! آدھی رات کو اگر چھت سے آوازیں آئیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''

''بھوت، آسیب! ہوائی مخلوق دورے پر آئی ہے۔''

دادی نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے میرے مبہم سوال کا جواب میری توقع کے عین مطابق دیا۔

''واقعی چھت پر بھوت اترتے ہیں؟''

میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں سو فی صد...... یہاں شہروں میں تو ایسا کم ہی ہوتا ہے، آبادی کیونکہ بہت بڑھ گئی ہے اور وہ مخلوق یہاں کے انسان نما بھوتوں سے دور بھاگتی ہے۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے دادی نے مجھے گھوری سے نوازا تھا۔

میں گھوری کو نظر انداز کرتے ہوئے چھت کے بھوتوں کے متعلق سوچنے لگی۔

''دادی! کیا وہ نیچے اتر کر گھر کے مکینوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟''

میں نے اگلا سوال داغا۔

''وہ بھوت ہوتے ہیں، انسان نہیں جو خواہ مخواہ دوسروں کو نقصان پہنچاتے پھریں۔''

دادی نے انسان کے کردار پر گہری چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔ میں پہلو بدل کر رہ گئی۔

کچھ دیر دادی کے پاؤں دبا کر ثواب کمایا، لگے ہاتھوں اگلا منصوبہ بھی ترتیب دے ڈالا۔

اپنی کزن نائلہ کو فون کیا جسے بھوتوں سے ملاقات کا بے حد شوق ہے۔

''نائلہ! تمہارے لئے بھوتوں کا بندوبست کیا ہے۔ ملاقات کرنا چاہتی ہو تو شام سے پہلے چلی آؤ۔''

میں نے دوسری طرف سے اس کی آواز سنتے ہی بنا علیک سلیک کے مدعا بیان کر دیا۔

''مائی ڈیئر کزن! تم ٹھیک تو ہو، مجھے تمہاری دماغی حالت پر شک ہو رہا ہے۔''

وہ استہزائیہ ہنسی۔

''تمہیں بھوت دیکھنا ہے تو چلی آؤ، اگر نہیں دیکھنا تو بیٹھی ہنستی رہو۔ خدا حافظ''

''کیا سچ مچ تم نے بھوت قابو کر لیا ہے؟''

میرے الوداعی کلمات سن کر وہ یکدم سنجیدہ ہوئی۔

''تفصیل جاننے کے لیے تمہیں یہاں آنا ہوگا۔ خدا حافظ''

میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ تجسس کی ماری اگلے ایک گھنٹے سے قبل ہی ہمارے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

''ارے اسے ایسا کیا کہہ دیا کہ یہ یہاں آنے کے لیے باؤلی ہوئی جا رہی تھی اور آتے آتے یہ بیگ بھی اٹھا لائی جیسے یہاں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔''

ماموں جان بھنویں اچکا کر مجھ سے استفسار کر رہے تھے۔

''ماموں جی! امتحان ہونے والے ہیں اس لئے سوچا پڑھائی کا کوئی شیڈول ترتیب دے لیا جائے۔''

مجھے بر وقت یہی بہانہ سوجھا۔

''ماشاءاللہ! اللہ پاک کامیاب کرے آمین۔ تم لوگوں کی محنت واقعی قابل ستائش ہے۔''

ماموں جان دعائیہ کلمات کی ادائیگی کے بعد اماں جان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئے اور ہم دونوں گلی گلی کرتے کمرے میں چلے آئے۔

''جلدی بتا، ماجرا کیا ہے؟''

نائلہ بے صبری ہوئی جارہی تھی۔

میں نے سارا قصہ اس کے گوش گزار کرڈالا۔

''تمھیں یقین ہے کہ وہ آج پھر آئیں گے۔''

نائلہ کمر پر ہاتھ رکھے مجھے گھورنے لگی۔

''سو فیصد یقین تو نہیں ہے مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ آئیں گے۔''

میں منمنائی۔

''ان شاءاللہ! کھولڑی ...... ان شاءاللہ''

کہہ کر وہ اپنے بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

''یہ دیکھو میں پوری تیاری کے ساتھ آئی ہوں، آخر بھوت صاحب سے ملاقات ہے، کوئی مذاق تھوڑی ہے۔''

اس نے کالے رنگ کا جوڑا اور چشمہ بیگ سے نکال کر بیڈ پر رکھا۔

''میڈم جی بھوت سے ملاقات کرنی ہے۔ یہ کالا جوڑا ہی کیوں پہننا ہے وقت ملاقات۔ اور اس کالے چشمے کی کیا منطق ہے، کالی رات میں کالا چشمہ، بھوت میاں تو نظر ہی نہیں آئیں گے۔''

نائلہ کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

''کم عقل ہوگی تم...... یہ دیکھو، کھولو اور پڑھو۔''

اس نے گویا میری سوچ پڑھ لی تھی۔ کڑے تیوروں سے ایک کتاب میری طرف اچھالی جسے میں نے کمال مہارت سے ہوا میں اچک لیا۔

''ہوائی مخلوق سے ملاقات کے چند اصول''

کتاب کا نام دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت کے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پھیل گئیں۔

تیزی سے ورق گردانی کرنے لگی۔

''اگر آپ کرنے جارہے ہیں بھوت صاحبان سے ملاقات تو رکیے! چند حفاظتی انتظامات کرتے جائیے۔''

آپ کالے رنگ کا جوڑا زیب تن کیجیے۔ ایسا کرنے سے بھوت آپ کو اپنی ہی جیسی کوئی مخلوق سمجھتے ہوئے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ دوسرے نمبر پر آپ کو لگانا ہے کالا چشمہ (سن گلاسز) ایسا کرنے سے بھوت آپ کو زیادہ خوفناک نہیں نظر آئے گا یوں آپ بنا خوفزدہ ہوئے اس کا دیدار کرسکیں گے۔

''اُف! کہاں سے ملی تمھیں یہ کتاب؟''

میرا دل چاہا اس کتاب کے مصنف کے ساتھ ساتھ نائلہ کو بھی اکیس توپوں کی سلامی دے ڈالوں توپ کے آگے باندھ کر۔

''کتنے عرصے سے اس دن کے لیے سنبھال رکھی تھی، آج کام آئیں گی یہ معلومات۔'' اس نے کتاب میرے ہاتھ سے اچک کر بہت احتیاط کے ساتھ واپس بیگ میں رکھ لی۔

میں تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔

رات کے کھانے کے بعد ہم دونوں ملاقات کی تیاری کرنے لگے۔ کتاب کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے نائلہ نے کالا جوڑا پہن لیا اور زبردستی مجھے بھی پہنا دیا۔ وضو کر کے سورۂ جن کی تلاوت کرکے اپنے گرد حصار باندھا۔ اب ہم کمرے میں دبکے بیٹھے سب کے نیند کی آغوش میں جانے اور بھوتوں کی آمد کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔

اچانک چھت سے کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔

''آگئے۔''

نائلہ خوشی سے چلا اٹھی۔ میرے ٹھنڈے پسینے چھوٹ پڑے۔ ہراساں نگاہوں سے گھڑی دیکھی جو کہ بارہ بجنے کا اشارہ دے رہی تھی۔

''آج جلدی آگئے۔''

میں نے مریل انداز میں کہا۔

''اٹھ بھی جاؤ محترمہ!''

نائلہ نے کہنی ماری۔

میں ایسے اٹھی جیسے ابھی ابھی پولیو کا ٹیکہ ہوا ہو۔ بنا کوئی آواز پیدا کیے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی جانب بڑھی اور دبے قدموں اوپر چڑھنے لگے۔ اوپر سے آتی آوازیں بدستور جاری وساری تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح لیے ہم دونوں مسلسل آیت الکرسی کا ورد کررہے تھے۔ کانپتے دل اور ٹانگوں کے ساتھ ہم چھت تک پہنچے۔ کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا، آنکھیں بھینچ کر کھلی فضا میں نکل آئے۔ گہری سانس لے کر اناللہ وانا الیہ راجعون کہتے ہوئے بھوت میاں کے دیدار کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ چاندنی رات میں چھت پر گویا دن چڑھا ہوا تھا ٹھنڈی تازہ ہوا نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ چھت پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ بھوت کہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہم مایوس ہوکر پلٹنے لگے تو کچھ سائے بھاگ کر چھت پر بنے سٹور روم کی طرف جاتے دکھائی دیے۔

''وہ رہے بھوت......''

نائلہ نے سرگوشی کی۔

''بھاگ چلو نائلہ!''

بقیہ صفحہ نمبر:69

ایوب اختر

الف نگر ہے بہت پیارا

الف سے اچھا، نون سے نیارا
الف نگر ہے بہت پیارا

کام ہے اعلیٰ، نام ہے اعلیٰ
اس کا بہت مقام ہے اعلیٰ

کرتا ہے یہ ادب کی خدمت
علم کی خوب دلائے رغبت

لکھنے والے نئے، پرانے
سارے ہیں اس کے دیوانے

یہ ہے ایک مثالی پرچا
ہر جانب ہے اس کا چرچا

بچوں کے دل کو یہ بھائے
ہر کوئی اس کے گن گائے

رنگ برنگی ہیں تصویریں
خوب مزے کی ہیں تحریریں

لطف بھری ہر ایک کہانی
دیتی ہے اک سوچ سہانی

نظمیں ہیں کیا خوب پیاری
اچھی اچھی اور معیاری

کاپی ملتی ہے اعزازی
لکھنے والے سب ہیں راضی

تھوڑا سا ہنس لیں

حمیرا امجد الرحمٰن شیخ

دو سال قبل کی بات ہے میری چھوٹی بہن رقیہ جو کہ اس وقت آٹھ سال کی تھی، اپنی حاضر جوابی اور چلبلی حرکات کی وجہ سے سب گھر والوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی تھی۔

ایک دن حسب معمول سب عشا کے کھانے کے بعد ہلکی پھلکی گفتگو میں مگن تھے کہ اسی دوران چھوٹے بھائی محمد نے کمپیوٹر کے مضمون کی کاپی ہاتھ میں اٹھائی اور اونچی آواز میں دہرانا شروع کیا۔

"There are four main types of computer..."

سب یک دم خاموش ہو گئے۔

اتنے میں پھر اس نے دہرایا۔۔۔

"there are four main...."

اب کی بار سب اسے دیکھنے لگے۔۔۔

"There are four...."

تیسری مرتبہ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ ہماری قوت سماعت جواب دے گئی، ہم سے رہا نہ گیا۔۔

"آئے ہائے! تم تو شروع ہی ہو گئے ہو، کچھ پتہ بھی ہے جو پڑھ رہے اس کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب؟"

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے چھوٹا بھائی آنکھیں پھاڑے ہمیں یوں گھورنے لگا، جیسے ہم نے الجبرا کا کوئی سوال حل کرنے کا کہہ دیا ہو۔ اتنے میں رقیہ عادت سے مجبور میدان میں کود پڑی۔

"ہاں! تو کیا مشکل ہے اس میں، میں ابھی بتاتی ہوں،" اس کا مطلب ہے کہ۔

"وہاں پر چار آدمی کمپیوٹر پر بیٹھے ٹائپنگ کر رہے ہیں۔"

"ہیں! یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ ترجمہ کس صدی میں ایجاد ہوا ہے؟ خدا کا خوف کرو کچھ لڑکی۔"

ابھی ہماری بات جاری ہی تھی کہ رقیہ کو اپنی ذہانت کی یوں دھجیاں اڑتی ہوئی برداشت نہ ہوئیں۔ اور فوراً بول پڑی۔

"ارے! کیا ہوگیا باجی آپ کو یہ ہی تو اس کا مطلب ہے، میں سمجھاتی ہوں آپ کو یہ دیکھیں۔

There are وہاں پر

Four main چار آدمی

Types ٹائپنگ کر رہے ہیں

Of computer کمپیوٹر پر

بس پھر کیا تھا وہ تو اپنی منطق سمجھا کر اٹھ گئی اور یہاں زوردار قہقہہ گونجا گھر والے ہنس ہنس کر دہرے ہوگئے۔

ایسے ہی ایک بار بچوں کے امتحانات ہو رہے تھے۔ اور بڑا ہونے کے ناطے انہیں تیاری کروانے کی ذمہ داری ہمارے ناتواں کندھوں پر آ گئی تھی۔ کل رقیہ کا انگلش کا پیپر تھا۔ اور ہم سب گھر والے اس کی انگلش سے بہت گھبراتے تھے۔ (کہیں کوئی انگریز اس کی انگریزی سن کر خودکشی ہی نہ کرلے اماں حضور صبح سے ہی ہماری کلاس لے رہیں تھیں۔)

"ارے! کیا فائدہ تمہارے پڑھا لکھا اور بڑا ہونے کا، بچوں کے پیپر ز ہی اگر اچھے نہ ہوں، تیاری کرواؤ انہیں۔"

ہم اپنی صبح سے اب تک بچوں کے پیچھے خون پسینہ ایک کرنے کی روداد سنانے ہی لگے تھے کہ رقیہ بول پڑی:

"ارے اماں! آپ کبھی مطمئن بھی ہو جایا کریں۔ صبح سے پڑھ رہی ہوں، سب تیاری ہے۔"

"یہ جو قینچی کی طرح تمہاری زبان چل رہی ہے نا، جس دن رزلٹ آئے گا اسی دن ساری حقیقت سامنے آجائے گی۔ اور تب میں لوں گی تمہاری خبر۔"

اماں حضور دھمکاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور ہم معصوم سی صورت لئے دروازے کو تکنے لگے۔

اگلے دن جیسے ہی پیپر دے کر رقیہ گھر آئی ہم اس کی طرف لپکے۔

"تو کیسا ہوا تمہارا پیپر؟"

"ہمارے ہاں تو یہ ہی معمول ہے، امتحانات کے دوران گھر آتے ہی سب بڑے سب سے پہلے یہ سوال کرتے اور ہمیں پوری روداد اپنے بڑوں کو سنانی پڑتی۔ لہٰذا روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے بڑا ہونے کا ثبوت دیا۔"

"بہت بہت بہت اچھا ہوا، سارا لکھا ہے، کچھ بھی نہیں چھوڑا، اتنا آسان تھا نا کہ بہت۔"

رقیہ کی گفتگو جاری تھی کہ ہم سے رہا نہ گیا۔

"ارے ایسا پیپر تھا یا حلوہ، ادھر دکھاؤ اپنا سوالیہ پرچہ میں بھی دیکھوں، آیا کیا ہے۔"

سوالیہ پرچہ ہاتھ سے لیتے ہوئے ہم نے گلا صاف کیا۔

"ہاں جی! تو اس پہلے سوال کا کیا جواب لکھا ہے؟"

ہم نے مصنوعی رعب جماتے ہوئے پوچھا۔

دوسری طرف طوطے کی طرح رقیہ ٹیں ٹیں کرتے ہوئے شروع ہوگئی۔

"شاباش! چلو جملے بتاؤ کیا کیا بنائے ہیں۔"

اگلے سوال کی طرف بڑھتے ہوئے ہم گویا ہوئے۔

"یہ کیا لکھا ہے؟"

"ہاں! misplace! اچھا اس کا کیا جملہ بنایا ہے؟"

"یہ تو اتنا آسان ہے، ایک منٹ میں اس کا جملہ بنا لیا تھا۔"

چٹکی بجاتے ہوئے رقیہ کہنے لگی۔

"ارے! بتاؤ تو سہی بنایا کیا ہے۔"

ہم نے تجسس سے کہا۔

اس کا جملہ بنایا تھا۔

"Misplace is best teacher"

جھٹ سے جواب رقیہ نے جواب دیا۔ اور ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"ہائے اللہ! میں کہاں جاؤں، ارے نِکمی! اپنی ٹیچر سے اس کا مطلب ہی پوچھ لیا ہوتا۔ یہ کیا لکھ آئی ہو تم۔"

ہم رقیہ کی ذہانت کا رونا رو ہی رہے تھے کہ وہ جھٹ سے بول پڑی۔

"ارے باجی ٹھیک ہی تو ہے۔"

Mis, کا مطلب ٹیچر اور misplsce ٹیچر کا نام تو ہم نے بھی لکھ دیا۔

"Misplace is best teacher."

رقیہ کی وضاحت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن ہماری قوتِ سماعت جواب دے چکی تھی۔ ہم سر پکڑے اور منہ کھولے دنیا مافیا سے بے خبر بس رقیہ کے چپ ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

ہمیں تب ہوش آیا جب معصوم سی شکل بنا کر ہماری چھوٹی بہنا نے ہم سے ایک مشکل سا سوال کیا۔

"باجی میں ذہین ہوں نا؟"

"یا کیا۔۔۔؟؟"

آگے آپ خود سمجھ جائیں۔ آپ تو سمجھدار ہیں نا!!!!

☆......☆......☆

چھوٹی بی کے کارنامے

ریحانہ اعجاز

یہ ان دنوں کی بات ہے جب چھوٹی بی اسکول جایا کرتی تھی۔

روزانہ صبح صبح صاف شفاف یونیفارم اور چمکتے جوتے پہنے، بالوں کی دو چوٹیاں بنائے وہ گھر سے چند روپے لے کر اسکول کی طرف روانہ ہوتی تھی۔ چھوٹی بی تھی تو چھٹی جماعت میں پر قد اپنی عمر سے خاصہ کم تھا۔ اسی لیے اُن کا نام چھوٹی بی پڑ گیا کوئی بھی اُن کو اصل نام سے نہ پکارتا تھا۔ اسکول پہنچنے کے لیے چھوٹی بی کو بس لینا ہوتی تھی اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مسافروں سے بھری بس میں جگہ حاصل کی جائے۔ وجہ یہ تھی کہ اس بھری بس میں چھوٹی بی کی شرارتوں کے لیے کافی گنجائش ہوتی تھی جب کہ خالی بس میں شرارت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اور چھوٹی بی کا خمیر تو گوندھا ہی شریر مٹی سے گیا تھا۔ بنا شرارت کیے، انہیں کھانا ہضم ہی نہ ہوتا تھا لوگ خالی بس کا انتظار کرتے ہیں اور چھوٹی بی شرارتیں کرنے کے لیے بھری بس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ خیر، چھوٹی بی کو بھری بس مل جاتی اور چھوٹی بی اس بس میں سوار ہو کر آرام سے کھڑی ہو جاتی، کیونکہ بس زیادہ بھری ہوتی تھی بیٹھنے کے لیے سیٹ مل جائے یہ ناممکن بات ہوتی۔ بعض اوقات جب جیب خرچ کم ملتا تو اپنا کرایہ بچانے کے لیے کنڈیکٹر کو گھما کے رکھ دیتی جب کہ اسٹوڈنٹ ہونے کے ناطے انہیں بہت معمولی رقم ادا کرنا پڑتی تھی لیکن وہ یہ رقم بچانے کے لیے اکثر کنڈیکٹر کے کرایہ مانگنے پر کہتی:

"میرا بھائی ہے پیچھے ان سے لے لیں۔"

جتنی دیر میں کنڈیکٹر زنانہ حصے سے کرایہ وصول کر کے پیچھے مردانہ حصے میں کرایہ وصولتا اتنی دیر میں چھوٹی بی کا اسکول آ جاتا اور چھوٹی بی شاداں وفرحاں چٹ پٹی چاٹ کی ڈبل پلیٹ کھانے کا تصور کرتی اسکول کی جانب بڑھ جاتی۔

چھوٹی بی کی روزانہ کی شرارتیں الگ الگ طرح کی ہوتی تھی۔

چلیے پھر آج آپ کو ایک دن کی روداد سناہی دیتے ہیں۔

ایک دن چھوٹی بی بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ دو عدد قریباً خالی بسیں سامنے سے نکل گئیں، لیکن چھوٹی بی کو تو حسب معمول بھری بس کا انتظار تھا۔ جیسے ہی اُن کی مطلوبہ بس آتی نظر آئی چھوٹی بی الرٹ ہو گئی۔ کھچا کھچ بھری بس میں چھوٹی بی زنانہ حصے کی طرف بڑھی اور اپنا راستہ بناتے ہوئے اندر گھس گئی۔ چاروں طرف نظر دوڑائی کہاں شرارت کی جائے۔ کس کو ستایا جائے؟

چھوٹی بی نے اپنے دیدے گھما گھما کے اطراف کا جائزہ لیا دفعتاً کانوں میں دو عورتوں کے لڑنے کی آواز سنائی دی۔

"اے بہن! ذرا دور ہٹ کر کھڑی ہونا میری گود میں بچہ ہے۔"

"ارے! تو کیا میرا قصور ہے۔ جگہ کہاں ہے؟ میں اتنی مشکل سے کھڑی ہوں بچہ تو میری گود میں بھی ہے۔" دوسری عورت تنک کر بولی۔

چھوٹی بی نے دیکھا وہ عورتیں ان سے دو ہاتھ کے فاصلے پر ہی تھی۔ پہلی کا بچہ رویا تو وہ پھر پچھلی عورت سے جھگڑنے لگی۔

"اے بہن! ذرا سی جگہ کھلی چھوڑ میرے بچے کو گرمی لگ رہی ہے۔"

"تو اس کے لئے کہہ کر اے سی لگوا لینا تھا نہ بس میں۔" دوسری عورت نے کھٹ سے جواب دیا۔

پہلی: "اچھا زیادہ میرے منہ نہ لگیو۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئیں۔ تو کچھ سکون ہو گیا۔

چھوٹی بی کو یہ سکون ایک آنکھ نہ بھایا، بھیڑ میں اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اگلی عورت کے بچے کو زور کی چٹکی کاٹ دی۔

بچہ پھپھک کر جو رویا تو ماں بولی:

"بس بیٹا بس تھوڑی دیر اور۔"

بچہ بولا: "اماں اس نے مارا ہے۔" بچے نے اپنے پیچھے کھڑی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ماں نے پلٹ کر دیکھا اور خونخوار لہجے میں اس عورت کے بچے کو ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

"لے اب مار میرے بچے کو۔"

دوسری عورت حیران پریشان۔

"اے! کیا پاگل ہو گئی ہے، کیوں مارا میرے بچے کو؟"

"پہلے تم نے مارا کہ میں نے؟"

پہلی چیخ کر بولی:

"میں نے کب مارا؟"

دوسری حیران پریشان بولی۔

"اے! تو کیا اتنا سا بچہ میرا جھوٹ بولے گا۔" پہلی نے آنکھیں نکالیں۔

پھر جو تو تو میں میں شروع ہوئی تو کنڈیکٹر کو بیچ بچاؤ کروانا پڑا۔

چھوٹی بی کی شر پسند طبیعت کو پھر بھی سکون نہ آیا اور انہوں نے بھیڑ میں ایک اور کارنامہ انجام دے دیا دونوں عورتوں کے دوپٹے کے پلو ایک دوسرے کے ساتھ زور سے باندھ دیئے اور اس سے پہلے کہ چھوٹی بی اس کارنامے سے لطف اندوز ہو پاتی ان کا اسکول آ گیا اور ناچار انہیں اترنا پڑا۔

چھوٹی بی چشم تصور میں ان دونوں خواتین کو "لڑتا جھگڑتا" دیکھ کر محظوظ ہوتے، لبوں پر مسکان سجائے اسکول کا گیٹ عبور کر گئی۔ ☆

بقیہ: بنگلہ نمبر 407

ہونے والے محلات اور بنگلوں کی دیواریں بہت ہی بلند تھی۔ اتنی بلند کی اس کی حد نگاہ بھی کام کرنا چھوڑ گئی تھی۔ اسے لگا جیسے دیواریں آسمان سے جڑی ہیں۔ محلات اور بنگلوں کے باہر عجیب طرح کے درخت تھے جن کے پتے انسانی قد وقامت سے دس گنا بڑے تھے اور ان پر عجیب وغریب قسم کے پھل لگے ہوئے تھے جن کا وزن شاید کئی من تھا۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرا کم ہوتا جا رہا تھا اور ایک جگہ پہنچ کر روشنی دیکھ کر اسے ایسے محسوس ہوا جیسے صبح کی پو پھوٹ رہی ہے اور عنقریب دن کا اجالا پھیل جائے گا۔

"بنگلہ نمبر 407" اس نے ایک سنسان بنگلے کی طرف دیکھا جو ایک کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے اس بنگلے کی مخالف سمت دیکھا تو ایک عالیشان بنگلہ دیکھا جو بے حد حسین تھا اور اس بنگلے کے اندر جب اس نے جھانک کر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بنگلے کے اندر خوبصورت پھل لگے تھے اور بنگلے کے اندر پانی کا ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا جس کا شفاف پانی اس کے دل کو لبھا رہا تھا۔ انواع واقسام کے کھانوں کا ایک دسترخوان لگا ہوا تھا۔

"میں اپنی دنیا میں تو اب واپس جا نہیں سکتا کیوں نہ اس عالیشان بنگلے کو اپنا مسکن بنالوں۔ جس میں ضروریات زندگی کی ہر شے کھانا، پینا اور صاف پانی دستیاب ہے۔" اس نے سوچ کر بنگلے کے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے ایک بار پھر مڑ کر "بنگلہ نمبر 407" کو دیکھا جو اسرار بھرا تھا۔ جمیل رک گیا۔ اسے تجسس ہوا کہ اس عالیشان بنگلے کے ساتھ یہ منحوس بنگلہ کس لئے ہے۔ اس نے پہلے اس بنگلے میں جانے کی ٹھان لی۔ وہ جیسے ہی بنگلے کے اندر داخل ہوا اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کا سانس بند ہو رہا ہے۔ اس کو چکر آنے لگے اور پھر وہ چکرا کر گر پڑا۔

جمیل کی جب آنکھ کھلی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ اس وقت صوفی صاحب کی کوٹھڑی میں پڑا تھا اور اس کا سر صوفی نواز کی گود میں تھا۔

"میں کہاں ہوں؟" اس نے آنکھیں ملتے ہوئے صوفی صاحب سے پوچھا۔

"تم شکر کرو کہ اس عالیشان بنگلے میں نہیں گئے ورنہ آج شاید تم اس دنیا میں نہ ہوتے اور اس غرق شدہ شہر میں کھو چکے ہوتے۔ تم وہ واحد انسان ہو جس نے بنگلہ نمبر 407 کا انتخاب کیا ورنہ وہ سارے لوگ جن کا پتا آج تک نہیں چلا وہ سب اس عالیشان بنگلے میں گئے تھے اور آج تک واپس نہیں آ سکے۔ اس غرق شدہ شہر سے واپسی کا بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے "بنگلہ نمبر 407" صوفی صاحب نے بتایا، لیکن جمیل ایک بار پھر نیند کی وادی میں کھو چکا تھا۔ صوفی صاحب جانتے تھے کہ اس واقعے کو بھولنے میں کچھ وقت لگے گا مگر وہ ایک دلیر بچہ ہے جلد ہی نارمل ہو جائے گا۔ ☆

خوشی کی خوشی

قرۃ العین خرم ہاشمی

اس کا لبادہ سفید رنگ کا تھا۔ جس پر جگہ جگہ سفید چمکنے والی چھوٹے چھوٹے ستارے اور موتی لگے ہوئے تھے۔ اس کے سارے وجود کے گرد روشنی کا جادوئی ہالہ جگمگاتا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ہنسی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ بہت دلفریب سی تھی شاید اسی لئے وہ ہر وقت مسکراتی رہتی۔ کافی دیر سے ادھر اُدھر گھومتی پھرتی، ہنسی کی سفید روشنی ہر طرف بکھیرتی وہ اچانک ایک پرانی بستی کے پاس پہنچ گئی۔ وہ دھیرے سے قدم اٹھاتی بستی میں داخل ہوئی اور سب نگاہوں سے چھپ کر ہر چیز کا جائزہ لیتے ہوئے اچانک ایک پرانے اور بوسیدہ سے گھر کے سامنے رک گئی۔ جہاں حسن اور مریم سات اور آٹھ سال کے بہت شرارتی اور نٹ کھٹ بچے رہتے تھے۔ دونوں بہن بھائی کا زیادہ تر وقت ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہی گزرتا تھا۔ ابھی بھی دونوں بہن بھائی اپنی مرضی اور پسند کی پنسل اور سکیل نہ ملنے پر ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔

”تم ہمیشہ میری لائی چیزوں پر نظر رکھتے ہو۔ امّی یہ نیلے رنگ والی پنسل اور اسکیل میرے لئے لائی ہیں۔“ مریم نے غصے سے کہا۔

”جی نہیں! امّی نے کہا تھا کہ نیلے رنگ والی پنسل اور اسکیل میرا ہے جبکہ تمہارے لئے پیلے رنگ کی چیزیں لائی ہیں۔“

حسن نے ضدی انداز میں کہا۔

”جی نہیں! مجھے پیلا رنگ پسند نہیں ہے۔ یہ میں ہی لوں گی۔“ مریم نے ضدی انداز میں کہا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بحث کرنے لگے۔ جب ان دونوں کا شور سن کر باورچی خانے میں کام کرتی ان کی ماں غصے میں بھری کمرے کے اندر آئیں اور دونوں کی لڑائی کی وجہ، پنسل اور سکیل اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ دونوں نے منہ بسور کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ حسن نے غصے سے بڑی بہن کو دیکھ کر کہا۔

”جی نہیں! ہمیشہ تم لڑائی کرتے ہو۔“ مریم نے چڑ کر کہا۔ دونوں بہن بھائی اداس سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر سکول کا کام کرنے لگے۔ دونوں کے پاس پرانی چھوٹی سی پنسل اور ٹوٹا ہوا اسکیل تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سوچنے لگے کہ اگر وہ دونوں لڑتے نہیں تو ابھی نئی پنسل اور اسکیل سے کام کر رہے ہوتے۔ غربت میں پلتے ان دونوں بچوں کی خوشیاں بہت چھوٹی چھوٹی سی تھیں۔ دونوں کے چہروں پر پھیلی اداسی دیکھ کر اسے اچھا نہیں لگا۔

اسی وقت صحن سے ان کی امّی کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں بچوں کو پکار رہی تھیں۔

”مریم! بارش شروع ہو رہی ہے جلدی سے چھت سے کپڑے اتار لاؤ۔

حسن تم مرغی اور چوزوں کو ڈربے میں بند کرو۔“

امّی نے باورچی خانے میں کھانا بناتے ہوئے آواز لگائی تو دونوں بچے تیزی سے بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ مریم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچی اور چند لٹکے ہوئے کپڑے اتار کر تیزی سے واپس پلٹی۔ بارش ایک دم ہی تیز ہوگئی تھی۔

مریم جیسے ہی آخری سیڑھی پر پہنچی، ہاتھ میں پکڑے کپڑے لٹک کر اس کے پاؤں میں آئے اور وہ سنبھلتے ہوئے بھی صحن میں کمر کے بل گر گئی۔ اسے گرتا دیکھ کر حسن گھبرا کر

ڈربے کا دروازہ بند کر کے بدحواسی میں آگے بڑھا تو کچی مٹی پر بارش کے پانی کی وجہ سے پھسلن بن چکی تھی۔ وہ پیٹ کے بل مٹی پر گرا تو سارا کیچڑ اس کے کپڑوں پر لگ گیا۔ اسی وقت شیڈ کے پیچھے چھپی سفید لبادے والی نے ایک چٹکی بجائی تو سفید روشنی تیزی سے ان دونوں کی طرف بڑھی اور وہ دونوں بچے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ امی جلدی سے کچن سے باہر نکلیں اور ان دونوں کو ذہن میں بس دیکھ کر خود بھی مسکرا دیں۔

"اندر جا کر کپڑے تبدیل کرو اور میز سے اپنی اپنی پنسل اور سکیل لے کر سکول کا کام کر لو اور اگر دوبارہ لڑے تو......!"

امی نے سنجیدگی اور مسکراتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ان سب کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر سفید لبادے میں ملبوس وہ چپکے سے وہاں سے نکلی اور بستی کے مختلف گھروں میں گھوم پھر کر دیکھنے لگی۔ جہاں کہیں اسے کوئی بچہ اداس نظر آتا، وہ فوراً اسے سفید روشنی کے جادو سے ہنسانے کی کوشش کرتی۔ وہ بستی میں اسی طرح گھومتی پھرتی رہی۔ کہیں بچے کھیلتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ کہیں کسی شرارت پر مسکرا رہے تھے۔ بچوں کی معصوم اور خوبصورت ہنسی اس کی کمزوری تھی بلکہ اس کے وجود کے گرد بنا سفید ہالہ اسی ہنسی کی وجہ سے بنا ہوا تھا۔

وہ ہر طرف خوشی کی سفید روشنی بکھیرتی، انجانے میں ایک عجیب سی بستی میں پہنچ گئی۔ جہاں ہر طرف ڈر اور خوف تھا۔ وہ بہت حیران تھی کہ یہاں کے لوگ اتنے پریشان اور خوفزدہ سے کیوں ہیں؟ اس نے اپنا جادو چلانے کی کوشش کی مگر تھوڑی دیر سے زیادہ اس کا جادو نہیں چل سکا۔ وہ بہت پریشان ہوئی۔ یہاں آ کر ایک عجیب سی چیز اس کے ساتھ ہوئی کہ اس کے سفید وجود کے گرد بنا روشنی کا ہالہ، ہلکا ہوتا ہوتا، اچانک سے غائب ہو گیا۔ وہ بہت پریشان ہوئی کیونکہ اس جادوئی ہالے کے بغیر اسے کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔ اسی پریشانی میں وہ ایک تنہا اور اونچی جگہ پر بیٹھ کر اداس اور ویران نظر آنے والی بستی کو دیکھنے لگی۔ وہ یہ معمہ حل کرنے کی کوشش میں تھی کہ اس کا جادو یہاں آ کر ختم کیسے ہو گیا ہے؟

وہ اسی سوچ میں گم بیٹھی تھی جب ایک سرخ گالوں والی بچی سر پر اسکارف باندھے اچانک اس طرف آ نکلی۔ بچی کی عمر دس سال کے قریب تھی۔ بچی کے چہرے پر معصومیت مگر آنکھوں میں بے تحاشا اداسی تھی۔

"آپ کون ہیں، پری؟" بچی نے سفید لبادے میں خوبصورت سی لڑکی کو بیٹھے دیکھا تو حیرانی سے سوال کیا۔

"کیا میں تمہیں نظر آ رہی ہوں؟"

اس نے گھبرا کر پوچھا اور پھر کچھ سوچ کر چپ کر گئی۔ اس کا جادوئی ہالہ تو غائب ہو چکا تھا۔ اسے دیکھنا اب ناممکن نہیں رہا تھا۔

"ہاں! میں بہت دور تک دیکھ سکتی ہوں۔" بچی نے معصومیت سے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ "تم ہنستی بھی ہو؟" اس نے مسکرا کر بچی سے سوال کیا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہماری بستی کے لوگوں کی ہنسی کسی نے چھین لی ہے۔ ہم نہیں ہنس سکتے۔" بچی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا کسی نے جادو کیا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔" اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہماری زمین پر جب سے آزادی کا سورج نکلنا بند ہوا ہے۔ ہمارے لوگوں کی ہنسی کہیں کھو گئی ہے۔" بچی نے اداسی سے کہا۔

"یہ کونسی بستی ہے؟ جہاں آزادی کا سورج نہیں نکلتا؟" اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

"کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ کشمیر کی کوئی بستی ہو، یا فلسطین کی، یا ظلم و ستم کے اندھیروں سے لڑتے کسی اور کی بستی ہو۔۔۔! ہم نے آزادی کا سورج نکلنے تک نہ ہنسنے کی قسم کھائی ہے۔" بچی نے پُرعظم لہجے میں کہا اور لکڑیاں اٹھائے وہاں سے آگے بڑھنے لگی۔

"سنو پیاری لڑکی! کیا تم نے کبھی جگنو اور تتلیاں دیکھی ہیں۔"

اس کے سوال پر بچی رکی اور حیرانی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سفید لبادے میں ملبوس لڑکی نے چٹکی بجائی تو چند سفید رنگ کی تتلیاں اور جگنو نمودار ہوئے جو اڑتے ہوئے اس بچی کے گرد گھیرا ڈال کر چکر کاٹنے لگے۔

کبھی جگنو بچی کی گلابی ناک سے ٹکرا جاتا اور کبھی تتلی بچی کے سرخ گالوں پر آ کر بیٹھ جاتی۔ بچی جگنو اور تتلیوں کو پاس دیکھ کر بے ساختہ کھلکھلا دی۔

"میں اپنی زندگی میں کبھی اتنا نہیں ہنسی، آپ کا بہت شکریہ۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟" بچی نے مسکرا کر سوال کیا۔

"میں خوشی ہوں! میرا کام سب میں خوشیاں بانٹنا ہے۔"

سفید لبادے میں ملبوس خوشی نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو بچی مسکراتے ہوئے واپس چلی گئی۔ جب تک وہ بچی نظر آتی رہی جگنو اور تتلیاں اس کے پیچھے جاتے رہے پھر اچانک وہ بچی گھنے اندھیرے میں گم ہو گئی تو جگنو اور تتلیاں بھی غائب ہو گئے۔ خوشی کے چہرے کی مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی تھی۔

"میں خوشی ہوں! میں نے ہمیشہ لوگوں میں خوشیاں بانٹی۔ بچوں کی ہنسی دیکھنے کے لئے کیا نہیں کیا مگر آج۔۔۔! ظلم و ستم کی اس بستی میں میرا جادو بیکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اس بچی نے ٹھیک کہا تھا کہ جہاں آزادی کا سورج نہ نکلتا ہو، وہاں خوشی نہیں رہتی ہے۔"

خوشی نے اداسی سے سوچا اور پھر وہاں سے غائب ہو گئی۔ وہ خوشی اب دنیا کے کسی اور کونے میں، معصوم بچوں میں خوشیاں تقسیم کر رہی تھی مگر اس خوشی کی اپنی خوشی اس اندھیری بستی کی اس معصوم اور اداس بچی کے پاس کہیں رہ گئی تھی!

☆......☆......☆

رمضو چاچا کا رمضان

عائشہ اطہر

"تابی، اُسامہ، عینی! کہاں ہو سب؟" امی ٹی وی لاؤنج سے سب کو پکار رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے سب اپنے ٹھکانوں سے نکل رہے تھے۔ پہلے تابی اپنے کمرے سے ہاتھ میں ویڈیو گیم پکڑے ہوئے برآمد ہوئی۔

"جی ماما جی!" مگن سے انداز میں ساتھ ساتھ ویڈیو گیم بھی جاری تھی۔

"جی ماما! آپ نے بلایا؟" اُسامہ اور عینی ایک دوسرے سے سیل فون چھین رہے تھے۔

"دے بھی دو کب سے گیمز کھیل رہے ہو۔ اب مجھے بھی کھیلنے دو۔" عینی مسلسل فون چھیننے کی کوششوں میں تھی لیکن قد لمبا ہونے کی وجہ سے اُسامہ بار بار عینی کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو رہا تھا اور عینی شدید جھنجلا رہی تھی۔

"ماما! کب سے کھیل رہا ہے گیمز فون پر مجھے نہیں دے رہا فون" عینی شکایت لگا رہی تھی۔

"بس یہی کام کرتے رہو تم لوگ یا ویڈیو گیمز کھیلتے رہو یا فون پر گیمز یا ایکس باکس پر لگے رہو۔ کوئی اور کام ہے تم لوگوں کو؟ کرونا کی نئی لہر کی شدت کی وجہ سے پھر تعلیمی ادارے بند ہیں اور تم لوگ کیسے اپنا وقت برباد کر رہے ہو؟" ماما بھی شدید غصے میں تھیں۔

"چلو سامان پیک کرو اپنا ہم لاہور جا رہے ہیں تم لوگوں کی نانو کی کال تھی کہ سب آجاؤ مل کر رمضان گزاریں گے۔" امی نے بات مکمل کی۔

"یاہو! ہم لاہور جا رہے ہیں عید بھی وہیں کریں گے۔" تینوں نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

"بس، امن، کرن، عائش، موسیٰ، آپا سب کے ساتھ رمضان اور عید مزا ہی آجائے گا۔" اُسامہ مزے لے لے کر بول رہا تھا۔

"ہاں ہاں! بالکل بہت مزا آنے والا ہے۔ تمھیں جلال ماموں کا پتہ ہے نا؟" عینی نے اپنے کرنل ماموں کا ذکر کیا جو ہر کام ڈسپلن سے کرنے اور کروانے کے عادی تھے۔

"ہم کیا پاپا کے بغیر عید منائیں گے؟" تابی نے سوال کیا۔

"نہیں! پاپا عید کی چھٹیاں ہوتے ہی پہنچ جائیں گے ان شا اللہ!" ماما نے تابی کو جواب دیا۔

"چلو اب تیار پکڑو صبح کی ٹرین ہے ہماری۔" امی نے پروگرام بتایا۔

"سب چیزیں دھیان سے رکھنا خاص طور پر اپنی سب کتابیں۔ میں وہاں جا کر نہ سنوں کے کتابیں وہاں رہ گئی ہیں خاص طور پر اُسامہ تم پچھلی چھٹیوں میں پورا اسکول بیگ ہی گھر چھوڑ گئے تھے۔" ماما نے اُسامہ کو یاد دہانی کروائی۔

امن، کرن، عابش اور موسیٰ نے شور مچاتے اور یا ہو کے نعرے لگاتے ہوئے تابی، عینی اور اُسامہ کا استقبال کیا۔

"کچھ کھانے کو ہے؟" بھوک کی کچی اور کھانے پینے کی شوقین عینی نے کرن کے کان میں سرگوشی کی۔

"آؤ کچن میں دیکھتے ہیں۔" کرن عینی کو لے کر باورچی خانے میں داخل ہوئی۔

"چاچا! پانی دے دیں" کرن بولی۔

"ہائیں! نانی دے دوں۔ نانی کہاں سے دے دوں؟ وہ تو اُوپر سو رہی ہیں۔"

"نانی انھیں پانی چاچا!" کرن ہنستے ہوئے دوبارہ قدرے اُونچی آواز میں بولی۔

"ارے نانی اُوپر ہیں کرن بیٹا۔" چاچا زور سے بولے۔ اب عینی بھی ہنسنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟" ہنسی روک کر عینی نے کرن سے پوچھا۔

"یہ رمضان چاچا ہیں اور سب ان کو رمضو چاچا کہتے ہیں ہمارے نئے کک ہیں اور اُونچا سنتے ہیں۔" کرن نے تفصیلی جواب دیا۔

"کھانے کمال کے بناتے ہیں۔" کرن پھر سے بولی۔

"حلال کراؤں مرغا؟" رمضو چاچا نے کمال کو حلال سمجھا۔

"کرلو کرلو مرغا حلال رمضو چاچا!" موسیٰ باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"مہمان آئے ہیں یہی مرغا پکاؤ۔" موسیٰ شرارت سے بولا۔

"سامان تو سب ہے۔" رمضو چاچا مہمان کو سامان سمجھے۔

"بھائی! دادو کا چہیتا مرغا ہے جسے حلال کرنے کا کہہ رہے ہو مرغے کو کچھ ہوا تو دادو آپ کو مرغا بنادیں گی۔" عینی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ باورچی خانے سے باہر آ کر وہ اُسامہ اور تابی کو بھی بتا رہی تھی کہ رمضو چاچا اُونچا سنتے ہیں اور باورچی خانے میں ہوئی ساری گفتگو بھی سنائی۔

گھر میں خوب رونق ہوگئی تھی سب اکٹھے تھے، خوش تھے۔ رات کا کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ ڈونگے کا ڈھکن ہٹاتے ہوئے دادو بولیں:

"رمضان میاں! کیا پکایا ہے؟ بھئی ثروت! بہت ذائقہ ہے ہمارے رمضان میاں کے ہاتھ میں۔ پکایا کیا ہے؟" رمضو چاچا کا جواب نہ پا کر دو دوبارہ قدرے اُونچا بولیں۔

"آپ کا مرغا راجہ خود حلال کرکے بنایا ہے۔" رمضو چاچا! دادو کی چیخ نما آواز ابھری ڈونگے کا ڈھکن دادو کے ہاتھ سے گرا اور وہ وہیں بے ہوش ہوگئی تھیں۔ سب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ جلال ماموں پورے جلال سے بول رہے تھے۔

"رمضو چاچا! کس کے کہنے پر راجہ کو حلال کیا آپ نے" جلال ماموں اتنی زور سے بول رہے تھے کہ پہلی بار میں ہی رمضو چاچا کو سب سنائی دیا۔

"بولیئے" جلال ماموں دھاڑے۔

"صاحب! جب سے راجہ کی رانی مری تھی (رانی دادو کی چہیتی مرغی کا نام تھا جو چند دن پہلے ہی مری تھی) تب سے راجہ اُداس اور سست تھا مجھے لگا یہ بھی اللہ میاں کے پاس نہ چلا جائے۔ اس لیے لذیذ قورمہ بنالیا کھا کر تو دیکھیے۔ واللہ! انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے" رمضو چاچا موسیٰ کا نام لینے کی بجائے ایک نئی ہی کہانی سنا رہے تھے۔ رمضو چاچا کی کہانی سن کر جلال ماموں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

رمضان کا چاند نظر آ گیا تھا اور سب بچے رمضو چاچا کو بتا رہے تھے کہ سحری میں کیا کیا کھانا ہے۔

"رمضو چاچا! میں پراٹھے کھاؤں گا" عابش بولا:

"کیا بیٹا!" رمضو چاچا کان پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"ذرا اُونچا بولو"

"چاچا! پراٹھے، پراٹھے"

"ارے بھئی! کیا کریں عمر ہوگئی ہے اب خراٹے تو بہت لیتے ہیں ہم دور تک آواز جاتی ہے پر کچھ ہو نہیں سکتا تم یہ بتاؤ سحری میں کیا کھاؤ گے؟"

"خراٹے کھاؤں گا" عابش ہنسی دبا کر بولا:

"اچھا پراٹھے!" رمضو چاچا بولے سب بچوں نے قہقہہ لگایا۔

"رمضو چاچا! کا سوفٹ ویئر اُلٹا چلتا ہے" امن بولی۔

پہلا روزہ سب نے مل کر کھا سحری میں اپنی پسند کی چیزیں کھائیں دادو کے ساتھ مل کر سب نے نماز پڑھی کلام پاک کی تلاوت کی اور پھر سب دادو کے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

"دادو! آپ بھی چھوٹے ہوتے روزے رکھتی تھی۔" عینی کو دادو کے بچپن کے قصے سننے میں بہت مزا آتا تھا۔

"بیٹا! میری امی اور دادو سحری میں بہت اہتمام کرتی تھی۔ سب کو جگاتے تھے بچے کیا بڑے کیا۔ سب کی پسند کے پکوان ہوتے تھے سحری میں چھوٹے بچے جن پر روزے فرض نہیں تھے وہ "چڑی روزہ" رکھتے تھے۔"

"چڑی روزہ کیا دادو؟" کرن نے پوچھا۔

"ہم سب بچے!" دادو مسکراتے ہوئے بولیں۔

"سحری میں پراٹھے، انڈے، دہی، کباب کھاتے تھے گھر کے باقی لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے۔ دوپہر بارہ بجے ہم سب بچوں کے لیے افطار تیار ہوتی تھی اور ہم سب اُس وقت وہ سب چیزیں کھاتے تھے۔ یہ ہوتا تھا "چڑی روزہ" کیونکہ روزہ فرض تو تھا نہیں عمر کم تھی لیکن شوق بہت تھا تو کوئی منع نہیں کرتا تھا بس ہم بچوں کی افطار جلدی ہو جاتی تھی" دادو نے عینی کی

طرف دیکھتے ہوئے بات مکمل کی۔ بچے دادو کے ساتھ بہت ہی خوش تھے۔

شام کا وقت تھا اور رمضو چاچا باورچی خانے میں افطار کی تیاریوں میں لگے تھے۔

''آؤ نا رمضو چاچا کو چھیڑتے ہیں'' اُسامہ کی شرارتی رگ بھڑکی۔

''کیا؟ کیسے؟ باقی گینگ بھی تیار تھا۔

''چلو تو سہی'' اُسامہ بولا۔ سارے اکٹھے ہو کر باورچی خانے پہنچے۔

''چاچا آج افطار میں کیا ہے؟'' عابش بولا۔

''باجا.....'' چاچا کان پر ہاتھ رکھ کر بولے انھیں جب کچھ صاف سنائی نہ دیتا وہ کان پر ہاتھ رکھ کر بولتے تھے۔

''باجا کیا کرو گے؟ افطار میں روزہ تو اذان کی آواز کے ساتھ کھلتا ہے۔ تم لوگوں نے باجا بجا کر کھولنا ہے؟'' رمضو چاچا کچھ پریشانی اور حیرت سے پوچھ رہے تھے۔

''ہاں چاچا! باجا ہی چاہیے'' مینی بولی۔

''نہیں بھئی میں اس وقت باجا لینے نہیں جا سکتا سب کام پڑا ہے کل لا دوں گا'' سب بچے اپنی بے ساختہ ہنسی روک رہے تھے۔

''اچھا چاچا! افطار میں رول ضرور بنانے ہیں'' اَمن نے کہا۔ ''ڈھول؟ چاچا نے اپنی سمجھ کے مطابق پوچھا۔

''جی چاچا ڈھول'' موسیٰ نے جواب دیا۔

''ارے بچے لوگو! افطار میں باجے اور ڈھول کا کیا کرنا ہے؟ کیوں مجھ بڈھے کو ستا رہے ہو؟ اتنا کام پڑا ہے پکوڑے، رول، سموسے، فروٹ چاٹ سب بننے والا ہے اور تم سب ستا رہے ہو مجھے۔'' باہر لاؤنج میں دادو ان سب کی آوازیں سن رہی تھی۔ جب سب باورچی خانے سے باہر آئے۔

''بہت بری بات ہے اُس بے چارے کو تنگ کرتے ہو۔'' دادو نے سب کو خوب ڈانٹا۔

''آج تو ڈانٹ سے ہی افطار ہو گئی'' عابش بولا۔

''تم نے کون سا اس افطار کے بعد باز آ جانا ہے انھیں تنگ کرنے سے'' مینی ہنستے ہوئے بولی۔ پورا رمضان اُن سب نے رمضو چاچا کے ناک میں دم کیے رکھا تھا۔ دادو ڈانٹ سے کر غل جلال سے ڈانٹ بھی خوب کھاتے رہے مگر باز نہیں آئے۔ عید کا چاند نظر آ گیا تھا۔ سب نے عید کا چاند دیکھ کر خوب دعائیں مانگیں اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر مبارک باد بھی دی۔

''رمضو چاچا باہر آئیں'' اَمن نے انھیں باورچی خانے سے باہر بلایا۔ رمضو چاچا ایپرن سے ہاتھ صاف کرتے باورچی خانے سے باہر تھے۔

''رمضو چاچا! ہم آپ کے لیے گفٹ لائے ہیں اور آپ کو وہ لینا پڑے گا'' موسیٰ بولا۔

''نہیں بھائی! میں یہاں سے کہیں شفٹ نہیں ہو رہا۔ میرا تو جینا مرنا یہیں ہے'' رمضو چاچا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ارے! شفٹ نہیں چاچا گفٹ'' اَمن نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی ڈبی کھولی اُس میں سے ایک چھوٹا سا آلۂ سماعت نکالا اور اُن کے ایک کان میں لگا دیا۔ اس آلۂ سماعت کی خاص بات یہ تھی کہ اس سے رمضو چاچا واضح طور پر سن سکتے تھے۔

''چاچا کیسا سنائی دے رہا ہے؟'' عابش بولا۔

''یہ تو کمال ہے؟'' خوشی سے اُن کا چہرہ چمک رہا تھا۔

''یہ ہم سب کی طرف سے ہے۔ ہم سب نے اپنی پاکٹ منی اکٹھی کر کے یہ آپ کے لیے لیا ہے۔'' تانی نے بتایا۔

شاباش! میرے پیارے بچو! دل خوش کر دیا رمضو میاں نے جس طرح سحری اور افطار میں سب کی خدمت کی ہے اُس کا صلہ تو اُن کو اللہ تعالیٰ دے گا۔ لیکن تم بچوں نے جو تحفہ اُن کو دیا ہے اُس سے پتا چلتا ہے کہ رمضان کا اصل مقصد تم لوگوں کو سمجھ آ گیا ہے۔ کیا بھلا؟ دادو نے سوال کیا:

''صبر، احساس، محبت، میانہ روی'' سب بچے اکٹھے بولے شاباش! آج سب میری طرف سے پیزا کھائیں گے دادو نے اعلان کیا۔

''دادو زندہ باد!'' موسیٰ نے نعرہ لگایا اور سب نے مل کر بھرپور قہقہہ لگایا۔ ☆

بقیہ: رمضان کا چاند

''بیٹا! اس کے علاوہ رمضان کے مہینے کی آخری دس راتیں بہت افضل ہوتی ہے۔ ان راتوں میں ہم صبح سحری تک جاگ کر قرآن تسبیحات اور نوافل پڑھتے ہیں۔''

''اچھا دادی! آپ کیا جاگتی ہیں ان دس راتوں میں؟'' حمیرا نے پوچھا۔

''جی میری جان! سب جاگتے ہیں۔'' دادی نے کہا۔

''بس دادی! اب سے میں بھی جاگوں گی آپ کے ساتھ اور خوب عبادت کروں گی۔'' حمیرا نے خوشی سے کہا۔ دادی نے حمیرا کا ماتھا چوما۔

''بیٹا حمیرا! کھانے آ جاؤ'' حمیرا کی ماما نے کمرے میں آ کر کہا۔ حمیرا اچھلتے ہوئے اپنی ماما کے گلے لگ گئی۔

''ماما! اس رمضان میں روزے رکھوں گی، اور تراویح بھی پڑھوں گی۔ قرآن پاک بھی ختم کروں گی اور دادی کے ساتھ آخری دس راتوں میں جاگوں گی اور.....'' حمیرا جلدی جلدی بولنے لگی۔

''ارے ارے بس بس سانس تو لے لو۔ سب کر لینا لیکن پہلے کھانا تو کھا لو۔'' ماما نے ہنستے ہوئے حمیرا کو روکا۔

''ہاں حمیرا بیٹا! پہلے کھانا کھا لو۔'' دادی نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''او کے ماما! حمیرا نے ماما کا ہاتھ پکڑا اور سب کھانا کھانے چلے گئے۔☆

شازیہ ستار نایاب

بندر کی شادی

جنگل میں منادی ہے
اک بندر کی شادی ہے

بندر نے جیکٹ چڑھائی
اپنی دُم اس میں چھپائی

بندریا نے سرخی لگائی
پاؤڈر کی بھی تہہ جمائی

سر پر جھٹ سے لے لی چنری
بندر نے بھی پہنی پگڑی

دُلہا دُلہن جب باہر آئے
شیروں نے پھر ڈھول بجائے

ہاتھی آئے چیتے آئے
جنگل کے سب باسی آئے

موروں نے بھی پَر پھیلائے
کوئل نے بھی گیت سنائے

سب ہی ناچے سب ہی جھومے
کھانا کھا کر گھر کو لوٹے

بنگلہ نمبر 407

احمد شیر خان

رات کی تاریکی میں وہ دھڑکتے دل کے ساتھ تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ جھینگروں کی آواز اسے مزید خوف زدہ کر دیتی۔ اڑتے ہوئے چمگادڑوں کی فوج جب اس کے کانوں کے پاس سے گزرتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ چمگادڑ اس پر حملہ آور ہو کر اس کو کچا کھا جائیں گے اس کا ذہن ابھی تک ماؤف تھا۔ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ وہ اپنے بے وقوفی پر نادم بھی تھا کہ وہ اس طرف نکل کیوں آیا۔ حالانکہ کبھی بھی اس نے اس طرف آنے کا تصور ہی نہیں کیا تھا جو کچھ اس نے سنا تھا وہی سب کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور وہی محسوس کر رہا تھا جس کے بارے میں اس نے اپنے گھر والوں اور دوستوں سے سن رکھا تھا۔

جمیل سرسبز پہاڑوں کے قریب ایک قصبہ میں رہتا تھا۔ وہ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس قصبے میں واقع سرکاری سکول میں زیر تعلیم تھا۔ بہن بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا اور گھر کا واحد بچہ تھا جو اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا باقی بہن بھائی سکول چھوڑ چکے تھے۔

جمیل سکول سے واپسی کے بعد شام کو قصبے سے ذرا دور صوفی نواز کے پاس ٹیوشن پڑھنے جاتا تھا۔ صوفی نواز اس قصبے کا سب سے پڑھے لکھے بزرگ تھے۔ عمر لگ بھگ 80 سال تھی۔ وہ ریٹائرڈ سکول ماسٹر تھا اور اس کو ریٹائرڈ ہوئے بھی بیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ صوفی نواز کے سارے بیٹے پڑھ لکھ کر شہر میں نوکری کر رہے تھے اور اس کی ساری بیٹیوں کی شادی دور افتادہ گاؤں میں ہو چکی تھی۔ صوفی نواز کی بیوی برسوں پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ بیوی کی وفات کے بعد صوفی نواز نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور وہ قصبہ چھوڑ کر قصبے سے تھوڑا دور ایک کوٹھڑی بنا کر اس میں رہنے لگا۔

وہ لوگوں سے بہت کم میل جول رکھتا تھا۔ جمیل کے والد نبی بخش کا اس سے پرانا تعلق تھا۔ جمیل اردو گرامر اور ریاضی میں کمزور تھا اور اس کی لکھائی بھی اتنی اچھی نہ تھی۔ جمیل کے والد نے صوفی نواز سے درخواست کی کہ وہ اس کو اردو گرامر اور ریاضی پڑھا دے اور اس کی لکھائی اچھی کرنے میں بھی اس کی مدد کرے۔ صوفی نواز چونکہ گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے اس لیے انھوں نے ٹال مٹول سے کام لیا لیکن جمیل کے والد کے بے حد اصرار پر انھوں نے ہار مان لی اور جمیل کی پڑھائی کے لئے روزانہ بعد نماز عصر ایک گھنٹہ بلا معاوضہ پڑھانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

جمیل روزانہ بلا ناغہ صوفی صاحب کے پاس عصر کی نماز کے بعد پڑھنے جاتا اور مغرب سے پہلے گھر واپس آ جاتا۔ صوفی نواز کی کوٹھڑی گاؤں سے دو کلومیٹر کی دوری پر تھی اور راستے میں کوئی آبادی نہ تھی اور سارا راستہ سنسان تھا۔ مغرب سے پندرہ بیس منٹ پہلے صوفی صاحب جمیل کو چھٹی دے دیتے تاکہ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائے اور اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چونکہ وہ گوشہ تنہائی اختیار کر چکے تھے اس لئے وہ اس اندھیرے اور کوٹھڑی کے گرد و نواح کے پر اسرار ماحول کے عادی ہو چکے تھے۔ تاہم وہ جمیل کو تاکید کرتے کہ وہ سیدھا گھر کی طرف رخ کیا کرے اور راستے میں کہیں نہ ٹھہرے۔

قصبہ کے شمال میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔ جہاں قصبے کے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلاتے اور نہلاتے تھے۔ قصبے کی عورتیں یہاں کپڑے دھونے آتی تھی۔ تاہم عصر کے بعد اس جھیل کی طرف کوئی رخ نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اس جھیل کے بارے میں مشہور تھا کہ اندھیرا پھیلتے ہی اس کے کنارے ایک پرانے شہر کا ظہور ہوتا ہے جو شاید بہت عرصہ پہلے فنا ہوا تھا۔ اور رات کے اندھیرے میں اس کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں جو کوئی غلطی سے بھی اس طرف کا رخ کرلے تو پھر وہ اسی دنیا کا ہو کر رہ جاتا ہے پھر وہ اس قصبے میں لوٹ کر نہیں آتا۔ کئی ایسے واقعات رونما ہوئے تھے کہ رات کو کئی لوگ جو غلطی سے اس طرف گئے وہ غائب ہو گئے اور ان کا پھر آج تک کوئی اتا پتا نہیں چلا تھا۔

شام کو جب جمیل صوفی صاحب سے ٹیوشن پڑھ کر واپس نکلا تو اس کو شدید پیاس محسوس ہوئی۔ وہ واپس مڑا اور صوفی صاحب کی کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ صوفی صاحب شاید باہر کی طرف جا چکے تھے۔

”صوفی صاحب!“ جمیل نے زور سے آواز دی مگر اس کی تیز آواز بھی صوفی صاحب نہ سن سکے۔ شاید وہ کہیں دور نکل گئے تھے۔

جمیل نے پانی پینے کے لیے گھڑے میں جھانکا تو اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا کیونکہ گھڑا ایسے خشک تھا جیسے صدیوں سے خشک ہو اور گھڑے کے اندر جالے لگے ہوئے تھے۔ جمیل کو حیرت کا جھٹکا لگا اور جھرجھری سی آ گئی کیونکہ آج آتے ہی پڑھنے سے پہلے ہی اس نے اس گھڑے سے پانی پیا تھا تو اس وقت یہ گھڑا ٹھنڈے پانی سے پورا بھرا ہوا تھا۔

پیاس شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صدیوں کا پیاسا ہو اور تھوڑی دیر اور اُسے پانی نہ ملا تو وہ پیاس سے مر جائے گا۔

اچانک اسے ایک خیال آیا کیوں نہ وہ اس جھیل سے پانی پی لے جو صوفی صاحب کی کوٹھڑی کے قریب تھی۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھ گیا مگر اس کے دل میں ایک انجانا خوف بھی تھا کہ شاید وہ دوسرے لوگوں کی طرح دوبارہ اپنے قصبے نہ لوٹ سکے۔ مگر پیاس اتنی غالب تھی کہ اسے اب کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ دیوانہ وار جھیل کے راستے کی طرف بھاگا۔ اس کا حلق سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ وہ گرتے پڑتے جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ جھیل کے اطراف میں سخت اندھیرا تھا۔

”یہ کیا، ابھی تو مغرب کا ہی وقت ہوا ہے۔ اتنا اندھیرا کیسے؟“ اس نے سوچا۔

پیاس کی شدت ایک بار پھر غالب آ گئی اور وہ جھیل کی طرف بھاگا اور ہاتھوں سے پانی پینے لگا۔ کچھ لمحوں بعد اس کی پیاس کم ہوئی تو اس نے اطراف کا جائزہ لیا تو اس کی آنکھیں کھلی ہی رہ گئیں۔ جھیل کے اطراف میں درجنوں فٹ پرانی دیواریں اور بنگلے نظر آ رہے تھے جن کا ذکر وہ کہانیوں میں پڑھتا تھا یا پھر جو اس نے اس جھیل کے بارے میں سن رکھا تھا وہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

وہ پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کا دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ غائب ہو کر گھر پہنچ جائے۔ سب کچھ بدل چکا تھا اسے ایسے لگا جیسے وہ ہزاروں سال کے پیچھے کسی زمانے میں چلا گیا ہو۔ اس نے چیخ مارنے کی کوشش کی مگر اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

وہ دیوانہ وار بھاگنے لگا۔ کبھی جب وہ تھک رکتا اور پھر وہ بھاگنے کی بجائے تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیتا۔ اسے اب خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اس کی منزل کہاں ہے۔ کسی بشر کی یہاں موجودگی نہ تھی۔ ہاں، البتہ عجیب قسم کی چمگادڑوں کے جھرمٹ یہاں ہوا میں رقص کرتے ہوئے اس کے کانوں کے پاس سے گزرتے تو اس کے دل کی دھڑکن ڈھول کی طرح بجنے لگتی۔ چھوٹی چھوٹی دیواروں والے پراسرار محل اب ختم ہو چکے تھے۔ اب نہایت بلند دیواروں والے بنگلے شروع ہو گئے تھے۔

”بنگلہ نمبر 407“ اس نے رک کر ایک بنگلے پر دیکھا اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ ہزاروں سال پہلے کے بنگلے پر نمبر کیسے درج ہے۔

وہ اب گھر پہنچنے کی امید چھوڑ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ بھی اس سنسان شہر کا حصہ بن جائے گا۔ اس نے دل کو تسلی دے کر ماضی کے اس شہر کی سیر کرنا شروع کی۔ اب اس کا ڈر ختم ہو چکا تھا کیونکہ وہ اب دوبارہ اپنی دنیا میں جانے کی امید چھوڑ چکا تھا۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آگے شروع

بقیہ صفحہ نمبر: 21

ہوا کے ساتھ ساتھ

احمد عدنان طارق

وہ موسم بہار کا ایک بہت خوشگوار دن تھا۔ موسم اتنا اچھا تھا کہ عتیق کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ ایک ننھا منا سا پری زاد تھا۔ وہ لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا، ناچتا ہوا گلاب کے پھولوں کے اوپر سے گزرا۔ وہ خوشی سے چلا تا ہوا کہہ رہا تھا۔

”مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ مجھے بھاگ جانا چاہیے۔“ وہ دراصل جھوٹ موٹ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے کوئی اُس کا تعاقب کر رہا ہو۔ وہ پکار رہا تھا۔

”اوہ خدایا! میرے پیچھے تیز ہوا لگ گئی ہے۔“ وہ ہوا میں چھلانگیں لگاتا ہوا بھاگتا جا رہا تھا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ وہ شور مچا کر کہہ رہا تھا۔

”وہ میرے پیچھے آ رہی ہے۔ تیز ہوا میرے پیچھے آ رہی ہے۔ یہ تو مجھے اڑا کر چاند پر لے جائے گی۔ یا ہو سکتا ہے ستاروں پر لے جائے۔ میں تو اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگ رہا ہوں۔“

بے چارے خرگوشوں نے چھلانگیں لگا کر خود کو راہ سے پرے کیا۔ ایک نیل کنٹھ اُس کے پیچھے اُڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا:

”عتیق مجھے تو بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے؟“ لیکن عتیق نے اُس کی بات پر کان نہیں دھرا اور بھاگتا رہا۔ ایک گلہری نے درخت پر چڑھ کر خود کو محفوظ کیا۔ عتیق نے اُس دن جو پری زادوں کا مخصوص چوغا پہن رکھا تھا۔ وہ ہوا میں اُڑتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کشتی کا بادبان۔ اُس نے گلہری کو بتایا:

”میری راہ سے ہٹ جاؤ ورنہ تیز ہوا مجھے پکڑ لے گی۔“

ایک ننھا سا ہرن پھدک کر راستے سے پرے ہوا۔ وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے حیران پریشان عتیق کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جانے کیوں عتیق اس طرح کی حرکتیں کر رہا ہے؟ آخر کون ہے جو اس کا پیچھا کر رہا ہے؟ آخر ہرن کے بچے نے خوفزدہ ہو کر فیصلہ کیا اور وہ بھی تیزی سے عتیق کے پیچھے بھاگنے لگا۔ خرگوش تو پہلے ہی ڈر گئے تھے وہ بھی ننھے ہرن کے پیچھے ہو لیے۔ وہ دل میں اندازہ لگا رہے تھے کہ تیز ہوا کتنا نقصان کر سکتی ہے جس کی وجہ سے عتیق بھاگ رہا ہے۔ اور ہوا میں اُڑتا ہوا ناچتا جا رہا ہے۔ راستے میں اُنہیں دو بونے یمی اور جمی جاتے ہوئے ملے۔

وہ پاگلوں کی طرح حرکتیں کرتے عتیق کو دیکھ کر مسکرائے ایک زور سے کہنے لگا:

”اب آسمد تمہارا کیا ارادہ ہے؟ ذرا بچ کر جاؤ۔ راستے میں سنا ہے زار جادوگر آ رہا ہے۔ صبح میں نے دیکھا تھا وہ غصے میں لگ رہا تھا۔ یہ نہ ہو وہ تمہیں کھمبی کا پودا بنا کر خود اوپر بیٹھ جائے۔ آگے وہ ایک دو بونوں کے ساتھ ایسا کر چکا ہے۔“ یہ بات سن کر عتیق تھوڑا سا آہستہ ہوا۔ اُسے معلوم تھا کہ زار جادوگر اچھا نہیں ہے۔ اُسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن عتیق کو خود پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ زار کے ہتھے نہیں چڑھے گا۔

وہ اب جنگل میں اس طرح اُڑتا، ناچتا جا رہا تھا جیسے تیز ہوا میں ٹوٹا ہوا سوکھا پتا۔ وہ اب بھی ظاہر کر رہا تھا۔ جیسے تیز ہوا موت بن کر اُس کا پیچھا کر رہی ہو۔ پھر ایک بڑے بوڑھے برگد کے پار جاتے ہوئے وہ پورے زور سے کسی سے جا ٹکرایا اور اُس کی ناگہانی ٹکر جس سے ہوئی۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ زار جادوگر تھا۔ کیسا عجیب اتفاق تھا۔ زار گر کھا کر

گرا اور اب کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح لمبا لیٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس کی سانس بند ہوگئی ہو۔ عزریق دیکھے بغیر چلایا:

"میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ تیز ہوا میرا پیچھا کر رہی ہے۔" زار غصے میں چلاتا ہوا بولا: "کیا بکواس ہے؟ کون پیچھا کر رہا ہے؟ یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟ ذرا اس ڈرے ہوئے ہرن کے بچے اور خرگوشوں کو دیکھو۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے عزریق کا ایک تختہ پکڑ لیا۔

عزریق اونچی آواز میں بولا۔ "میرا تختہ چھوڑو۔ اور جان بچانے کے لیے دوڑو۔ تیز ہوا میرا پیچھا کرتی ہوئی آ رہی ہے۔ یہ مجھے اُڑا کر چاند پر پہنچا دے گی۔ یا ہو سکتا ہے ستاروں پر لے جائے۔" اُس کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ واقعی تیز ہوا چلنے لگی اور اُس میں خاصی ٹھنڈک آ گئی۔ آسمان پر بادل ننھے سفید خرگوشوں کی طرح دوڑنے لگے۔ زار بھی ڈر گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ابھی بھی عزریق کا تختہ تھا۔ وہ چلّا کر بولا۔

"میری مدد کرو۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کیا کرنا ہے؟ میں بوڑھا ہوں۔ میں دوڑ نہیں سکتا۔ اور ہوا اتنی تیز ہوا۔ میں نہیں چاہتا یہ مجھے اڑا کر چاند پر لے جائے، میری مدد کرو۔ عزریق۔" عزریق کو شروع میں علم نہیں تھا کہ وہ کس سے ٹکرایا ہے۔ لیکن اب اُسے معلوم تھا۔

وہ غصے سے بولا۔ "پہلے میرا تختہ تو چھوڑو۔ مجھے بھاگ کر جان بچانی ہے۔ تیز ہوا میرے پیچھے ہے۔" زار بولا۔

"پہلے تم میری مدد کرو گے تو میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔" پھر وہ کھڑا ہو گیا اور اُس نے عزریق کا بازو پکڑ لیا۔ وہ اب بھی اُسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ تب ہی ہوا پوری تیزی سے سیٹیاں بجاتی ہوئی آ کر اس تماشے کو دیکھنے لگی۔ اُس کے آنے سے جادوگر کا ہیٹ سر سے اُڑ کر نہ جانے کہاں گیا۔ عزریق نے بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر اُسے واپس کیا۔ اب یہ ننھا پری زاد بھی حقیقت میں خوفزدہ ہو چکا تھا۔ وہ ہوا سے نہیں زار جادوگر سے خوفزدہ تھا کہ وہ کہیں اسے کسی نامعلوم منزل کی طرف نہ لے جائے۔ وہ اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ آخر وہ کیوں اس جادوگر سے ہی ٹکرایا؟

تیز ہوا کی سیٹیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اور اب جادوگر کا پہنا ہوا بھاری چغہ اُلٹا ہو کر ہوا میں اُڑنے لگا۔ زار ڈر کر ہوا سے بولا:

"اے ہوا! مہربانی فرما کر مجھ سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دے۔ عزریق بولو میں کیا کروں؟ میں اُڑ جاؤں گا۔ یہ چغہ تو اُڑ کر اتنا زور لگا رہا ہے جیسے کسی کشتی کا بادبان ہو۔" عزریق چیخ کر بولا۔

"اس درخت پر چڑھ جاؤ۔ میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔" وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اُس کی جان جادوگر سے چھوٹ جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے پورا زور لگا کر جادوگر کو قریبی درخت پر چڑھا دیا۔ یہ دیکھ کر تند ہوا کو اور مذاق سوجھا تو وہ پورے زور سے درخت کے تنے کو جھلانے لگی اب درخت کا تنا کبھی ایک طرف زمین کی طرف جھکتا تو کبھی دوسری طرف جیسے کوئی بحری جہاز سمندر کے پانی کی بڑی لہروں پر ڈولتا ہے۔ زار پھر چلایا:

"بچاؤ۔ بچاؤ میں اُڑ جاؤں گا۔ وہ دیکھو وہ ہوا پھر میری طرف آ رہی ہے۔ عزریق تمھیں سچ بتا رہا ہوں۔ میں اُڑ جاؤں گا کوئی ترکیب سوچو۔" عزریق چلا کر بولا۔

"مجھے اپنا کمر بند اتار کر دو تا کہ میں تمھیں مضبوطی سے درخت کے ساتھ باندھ دوں۔ وہ دیکھو تمہارا ہیٹ اُڑتا ہوا چاند کی طرف جا رہا ہے لگتا ہے وہ تمہارا وہیں رو کر انتظار کرے گا۔ کہ تم بھی اُڑتے ہوئے چاند پر نہ پہنچ جانا۔ مجھے کمر بند دو تا کہ میں تمھیں باندھ سکوں۔ جلدی کرو۔" یہ سن کر جادوگر نے ایک ہاتھ سے اپنا کمر بند کھولا۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ درخت کو پکڑ کر ہوا میں جھولتا رہا۔ عزریق نے کمر بند لیا اور بڑی مضبوطی سے اُسے درخت کے ساتھ باندھ دیا۔ پوری مضبوطی کے ساتھ۔

عزریق زور سے بولا: "اب تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تیز ہوا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بے شک یہ سارا دن اور ساری رات اسی شدت سے بھی چلتی رہے۔ تم بندھے ہوئے یہاں محفوظ رہو گے۔ دیکھا ہوا کتنی سیٹیاں بجا رہی ہے۔ خدا حافظ، خدا حافظ۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ہوا مجھے اڑاتی ہوئی زبردستی لے جا رہی ہے۔"

اور وہ پھر پہلے کی طرح ہوا میں چھلانگیں لگاتا ہوا دوڑنے لگا۔ ننھا ہرن اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ اب بھی یوں ظاہر کر رہا تھا۔ جیسے بہت خطرناک بلا اُس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ بول رہا تھا۔

"میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ وہ مجھے پکڑ لے گی۔" لیکن وہ پکڑا نہیں گیا۔ نہ ننھا ہرن اور نہ ہی اچھلتے کودتے خرگوش یا چھلانگیں مارتی ہوئی گلہری۔ صرف ایک زار جادوگر تھا جو پکڑا گیا تھا اور اب درخت کے ساتھ پوری مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ زور لگا کر خود کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ آزاد ہونے کے لیے جتنا زور لگاتا درخت کا تنا اُتنا ہی اُسے اِدھر اُدھر اور جھولاتا۔

وہ اب ہوا کو شور مچا کر پکار رہا تھا۔

"عزریق واپس آ کر مجھے کھول دو اور مجھے نیچے اتارو۔ ورنہ میں تمھیں ایک موم بتی کا شعلہ بنا کر پھونک مار کر بجھا دوں گا۔ آ جاؤ ورنہ میں تمھیں آئس کریم بنا کر دھوپ میں رکھ کر پگھلا دوں گا۔ میں...... میں۔"

لیکن عزریق تو وہاں سے دور جا چکا تھا۔ سارا دن دوڑ کر اور چھلانگیں لگا کر وہ بہت تھک چکا تھا۔ اور اب گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کے تھکے ہوئے ساتھی خرگوش۔ ننھا ہرن اور گلہری بھی قریب ہی گہری نیند سوئے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ وہ دن واقعی تیز ہوا کے نام رہا تھا۔ جس نے اس کھیل میں ان دوستوں کا پورا ساتھ دیا تھا۔

عزریق سویا ہوا خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔

"واقعی مزے کا دن تھا۔ بہت مزا آیا۔" ☆

باجی جن

سیدہ اقرا اعجاز

"ارے بھائی! یہ باجی جن کو دیکھا ہے کسی نے صبح سے نظر ہی نہیں آ رہی" گڈو نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے امی جان سے پوچھا تو امی بولیں:

"ارے بیٹا! تمھیں پتا تو ہے اس کی مصروفیت کا۔۔ ضرور کمرے میں گھس کر یوٹیوب پر کوئی جن قابو کرنے کا طریقہ دیکھ رہی ہوگی اور کیا کرنا ہے اس نالائق لڑکی نے۔" گڈو امی کا مزاج خراب دیکھ کر وہاں سے کھسک لیا کہ کہیں امی باجی کو چھوڑ کر اس کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔ باجی جن کا اصل نام تو عالیہ تھا لیکن ان کی زندگی کا سب سے بڑا خواب ایک جن قابو کرنا تھا جس سے وہ ہوم ورک سے لے کر اپنی ساری خدمتیں کروائیں۔ اپنی مرضی کے کھانے فری میں کھائیں اور ان کے پاس خوب سارا پیسہ ہو۔ truth or dare باجی جن کا پسندیدہ کھیل تھا جب بھی کوئی ان سے پوچھتا کہ ان کی سب سی بڑی خواہش کیا ہے تو باجی جن کا ایک ہی جواب ہوتا جن قابو کرنا۔ بس اسی وجہ سے ان کا نام ہی باجی جن پڑ گیا تھا۔۔ امی، ابو اور بہن بھائیوں کے لاکھ سمجھانے کے باوجود ان کے سر سے جن والا بھوت نہیں اتر پا رہا تھا۔ گڈو ان کو ڈھونڈتے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ باجی اپنے کمرے میں اگر بتیاں جلائے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ گڈو کو دھویں سے کھانسی آ گئی اور اس نے جلدی سے اگر بتیاں بجھا دیں۔ باجی غصّے سے چلائیں۔

''گڈو کے بچے! تم نے میری ساری محنت کا بیڑہ غرق کردیا۔ کیا ضرورت تھی اپنی تشریف کا ٹوکرہ اس وقت میرے کمرے میں لانے کی۔ سارے میرے چلّے کا ستیاناس کردیا۔''

''لیکن باجی! یہاں پر تو کوئی بھی بلا نہیں ہے'' گڈو ڈرتے ڈرتے بولا۔

''ارے بیوقوف! میں بلے کا نہیں چلّے کا بول رہی ہوں'' باجی جن نے تلملاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن باجی! یہ چلا کیا ہوتا ہے'' گڈو نے پھر دوسرا سوال کیا تو باجی چلائیں۔

''میرا نام ہے چلا۔''

''اوہ اچھا تو یہ بولیں نا'' گڈو سمجھنے والے انداز میں بولا۔ باجی نے اسے اپنی چپل اتار کر دے ماری جو کہ کسی جہاز سے بھی زیادہ تیز اسپیڈ سے گڈو کو لگی اور گڈو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

☆

صرف ہزار روپے میں جن کو قابو کرنے کا عمل سیکھیں۔ باجی جن نے کالج سے واپسی پر ایک دیوار پر لگا اشتہار دیکھا۔ انہوں نے نمبر نوٹ کرلیا۔ اگلے ہی دن وہ آستانے پر پہنچ گئیں۔ یہ کسی آستانے سے زیادہ ہسپتال لگ رہا تھا۔ گیٹ پر بڑا بڑا لکھا ہوا تھا۔ بجلی باجی تھوڑی دیر بعد باجی جن کا نمبر آگیا تو وہ باجی کے کمرے میں چلی گئیں۔ باجی کو دیکھ کر اس کو عینک والے جن کی بل بتوڑی یاد آگئی۔ بلکہ اس کی کاپی تھی وہ باجی۔ شاید اس نے بل بتوڑی سے متاثر ہوکر یہ لک اپنائی تھی۔ اس کے بال دیکھ کر کسی گھونسلے کا احساس ہوتا تھا۔ بجلی باجی کے پاس سے جو بو آرہی تھی۔ شاید گٹر کی بدبو بھی اس سے اچھی ہوتی۔

''آجا بچہ! یہاں آکر بیٹھ جا'' باجی نے اسے دیکھ کر کہا:

''باجی! میں بچہ نہیں بچی ہوں۔'' باجی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ باجی گڑبڑا گئیں اور بولیں۔

''اچھا بچی! بیٹھو نا۔'' باجی بیٹھ گئیں اور بولیں:

''بجلی باجی! میں نے آپ کا اشتہار دیکھا تھا دیوار پر لگا ہوا۔ میں بھی ایک جن کو قابو کرنا چاہتی ہوں، پلیز میری مدد کیجئے اس سلسلے میں۔'' باجی بولیں:

''تم پہلے ہزار روپے تو دو پھر میں بتاتی ہوں۔'' باجی جن نے اس کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھے تو بجلی اس کو جن والا عمل بتانے لگیں۔

☆

آخر چالیس دن کے اس چلّے کے بعد وہ دن آہی گیا جس دن باجی کو صبر کا میرا مطلب ہے چلّے کا پھل ملنا تھا۔ باجی زور وشور سے آنکھیں بند کئے عمل دہرا رہی تھی۔ ان کا عمل مکمل ہوتے ہی ایک عجیب سی آواز آئی، باجی نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو خوشی سے ان کی چیخ نکل گئی۔ ان کے سامنے ایک عجیب وغریب قسم کا آدمی سیاہ لباس پہنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے سر کو بھی اسی لباس کے ہڈ سے چھپایا ہوا تھا۔

''کیا تم ہی جن ہو؟'' باجی نے پوچھا تو اس نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

''اچھا! کیا تم میرے لئے جلیبیاں لا سکتے ہو؟'' باجی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تو اس آدمی نے اپنے لباس کی جیب سے کاغذ اور قلم نکالا اور کاغذ پر لکھ دیا۔

''جی ہاں! میں ابھی جلیبیاں لے آتا ہوں آپ سو روپے دے دیجئے'' باجی چونک اٹھیں۔ ''ارے! جن تو ہر کام فری میں کرتے ہیں۔ تم کیسے جن ہو؟'' جن نے پھر سے کاغذ پر لکھ دیا۔

''معاف کرنا میں اور قسم کا جن ہوں کوئی بھی کام پیسوں کے بغیر نہیں کرتا اور ہاں اس کے ساتھ ساتھ میں گونگا بھی ہوں اس لئے ہر بات کا جواب لکھ کر دوں گا۔''

''ارے! یہ گونگا اور نکما جن میرے ہی پلے پڑنا تھا۔'' باجی نے سوچا۔

''اچھا! چلو ایسا کرو میرا ہوم ورک کردو۔'' باجی بولیں تو جن نے کاغذ پر لکھ دیا۔

''آپ ایک انگریزی اسکول میں پڑھتی ہیں اور میں بھی اسکول ہی نہیں گیا نہ ہی مجھے انگلش آتی ہے اردو لکھ سکتا ہوں بس'' باجی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''اچھا ایسا کرو کچن میں گندے برتن رکھے ہوئے ہیں انہیں ہی دھو دو۔'' جن نے پھر سے پرچے پر لکھ دیا۔

''معاف کرنا لیکن میرے پاس غائب ہونے کی طاقت نہیں ہے اس لئے اگر میں برتن دھوں گا تو سب مجھے دیکھ لیں گے۔''

''اچھا تو پھر تم ایک کام کرو'' باجی بولیں اس نے کندھے اچکائے۔ ''تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' باجی چیخیں۔ جن نے پرچے پر لکھ دیا۔

''جیسی آپ کی مرضی اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گیا۔'' اور باجی جن بجلی باجی کو خوبصورت لفظوں میں یاد کرنے لگیں۔

☆

اگلے ہی دن وہ باجی کے آستانے پر گئیں تو پتہ چلا کہ باجی ایک فراڈ تھی۔ لوگوں کو بیوقوف بنا کر پیسے لوٹتی تھی۔ اس کو پولیس نے گرفتار کر کے آستانے کو سیل کر دیا تھا۔ اگر وہ باجی فراڈ تھی تو پھر وہ جن کیسے آیا تھا میرے پاس باجی جن نے سوچا۔ گھر واپس آکر وہ ابو کے کمرے کے پاس سے گزریں تو انہوں نے ابو کو بولتے سنا۔

''اللہ کا شکر ہے عالیہ بھی پڑھائی میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ میری بھی بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ ان فضولیات سے نکل کر پڑھائی پر توجہ دے اور ایک اچھی انسان بن جائے۔'' باجی نے سوچا: ''جی بالکل اب میں ایسی ہی بنوں گی ان شاء اللہ اور آپ کی امیدوں پر پورا اتروں گی۔'' اس دن کے بعد سے باجی بالکل ہی بدل گئیں۔ امی، ابو کو لگتا تھا کہ وہ خود ہی ٹھیک ہوگئی ہیں، لیکن اصل وجہ تو صرف باجی ہی جانتی تھی۔ (ختم شد) ☆

شیف ثانی

چکن ڈرم سٹکس

صائمہ مسلم

شیف ثانی روزانہ افطار میں پکوڑے سموسے کھا کھا کر تنگ پڑ چکی تھی اس لیے اس نے سوچا کہ آج افطار میں ڈرم سٹکس بنائی جائے۔ سب سامان اکٹھا کیا اور بنائی ڈرم سٹک۔ تو چلیں پھر ہم بھی بناتے ہیں۔

اجزا:

چکن (بون لیس)	ایک پاؤ
لہسن ادرک پیسٹ	آدھا چائے کا چمچ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچ
میدہ	ایک کپ
چپس	تین پاؤ
پانی	آدھا گلاس
تیل	حسب ضرورت

ترکیب کچھ یوں ہے:

چکن کے پتلے لمبے پارچے کر لیں۔ (جتنے پتلے پارچے کر سکتے ہیں کر لیں، تاکہ ڈرم سٹکس کی طرح لمبے اور پتلے ہو جائیں)

چکن میں لہسن ادرک کا پیسٹ، آدھا چائے کا چمچ کالی مرچ پاؤڈر، نمک اور ایک چائے کا چمچ تیل ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔

چکن کو ایک گھنٹے کے لیے میرینیٹ ہونے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔

ایک پیالے میں کارن فلور، نمک، آدھا چائے کا چمچ کالی مرچ پاؤڈر اور آدھا کپ میدہ ڈال کر مکس کر لیں۔

اب اس میں تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر مکسچر بنا لیں۔ (مکسچر اتنا گاڑھا رکھیں کہ آسانی سے چکن پر چپک جائے)

آدھا کپ میدہ ایک پلیٹ میں رکھ لیں۔ چپس کو اچھی طرح ہاتھ سے چورا کر لیں۔ تیل کو ہلکا گرم ہونے دیں۔

چکن کو پہلے میدہ لگا لیں اچھی طرح (چکن کے سارے پارچے پہلے میدے میں کوٹ کر کے رکھ لیں)

پھر مکسچر پہ لگائیں۔

آخر میں چورا کی ہوئی چپس پر کوٹ کریں۔

چکن ہلکے گرم تیل میں فرائی ہونے دیں۔ (تاکہ چکن گل جائے اور چپس کالے نہ ہوں)

جب چپس پر کلر آنے لگے نکال لیں۔

گرم گرم چکن ڈرم سٹکس تیار ہے، ہری چٹنی کے ساتھ کھائیں اور مزے اڑائیں۔

(چکن لیگ پیس بھی لے سکتے ہیں، بس دو تین گھنٹے میرینیٹ کرنے ہوں گے)

قسط:1

اڑن طشتری کا تجربہ

محمد احمد رضا انصاری

تاشفین نے اس رات کچھ عجیب اور ڈراؤنا سا خواب دیکھا تھا۔۔۔ڈر کے مارے وہ اچانک ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔اس کا گلا خشک تھا اور تنفس تیز۔

تاشفین چت لیٹا گہرے گہرے سانس لینے لگا۔۔اس کی نیند بھری آنکھیں آسمان پر گئیں اور تب ہی ادھ کھلی آنکھوں سے اس نے آسمان پر اس پراسرار شے کو دیکھا۔وہ تیز نیلی روشنی سی تھی۔ایک لمبی سی روشنی جس کا آگے والا حصہ بہت بڑا اور خوب روشنی میں لپٹا تھا جبکہ پچھلا حصہ باریک اور نیم روشن تھا۔اس نیلی روشنی کا رخ زمین کی جانب تھا اور وہ بے آواز سیدھی زمین کی طرف لپکی آ رہی تھی۔

چند ثانیے کے لیے تو تاشفین اپنی پلکیں جھپکنا تک بھول گیا اور ساتھ اپنے اس خوفناک خواب کو بھی جو رات کے اس پہر جاگنے کی وجہ بنا تھا۔تاشفین کی آنکھیں پوری کھل گئیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ کچھ زیادہ ہی کھل گئیں تھیں۔ساتھ حیرت کی زیادتی سے منہ بھی نیم وا سا ہو گیا۔وہ سکتے کے سے عالم میں لیٹا ٹکٹکی باندھے اس روشنی کو زمین پر آتا دیکھتا رہا۔

گرمیوں کے دن تھے۔دن بھر سورج آگ برساتا اور شام کو اس کے آسمان سے جاتے ہی ہلکی پھلکی ہوا چلنے لگتی تھی۔وہ پسماندہ سا گاؤں ایک چھوٹے سے شہر کے قریب واقع تھا۔یہ صحرائی علاقہ تھا اور ان کا گاؤں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان تھا۔وہاں ہلکا پھلکا سبزہ تھا۔کھجور کے درختوں کے جھنڈ گاؤں کے چاروں طرف کسی قدیم شہر کی فصیل کی طرح کھڑے تھے۔ان کا گاؤں طویل قامت درختوں کے بیچ تیز گرد کے طوفانوں اور آندھیوں سے محفوظ رہتا تھا۔دن میں صحرا جتنا گرم ہوتا تھا۔تاریکی چھاتے ہی ریت ٹھنڈی پڑ جاتی اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی۔رات میں موسم سرد سا ہو جاتا تھا۔گرمیوں میں تاشفین کے گھر والے چھت پر ہی سوتے تھے۔اس طرح بجلی کی بچت ہوتی اور وہ بغیر پنکھا چلائے آرام سے چھت پر سو جاتے تھے۔گاؤں کے مکینوں نے اپنے گھروں کے آس پاس بھی درخت لگائے ہوئے تھے۔ان لوگوں کا دن کا اکثر وقت ان ہی درختوں کی گھنی چھاؤں تلے گزرتا تھا۔

وہاں کچھ زمین کو قابل کاشت بنا رکھا تھا جہاں گندم، چنے اور مکئی کی فصلیں اگائی جاتی تھیں اور مال مویشیوں کے لیے گھاس وغیرہ تھی۔آب پاشی کا جدید نظام بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے فصلوں کو پانی کی تنگی نہیں ہوتی تھی۔تاشفین کے گاؤں میں ایک چھوٹا سا ہسپتال، ایک پرائمری اسکول تھا جہاں مخلوط تعلیم دی جاتی تھی۔دو تین مساجد اور چند دکانیں تھیں۔شہر چند کلومیٹر دور تھا۔

ایک چھوٹی سے سڑک گاؤں کو شہر سے ملاتی تھی۔ ضروریات زندگی کی زیادہ تر اشیا شہر سے لائی جاتی تھیں۔

ستمبر کا مہینہ تھا۔ اس روز خوب بارش برسی۔ بارش کے بعد ہوا بند ہونے کے سبب شدید حبس تھی گرمی کے مارے دم گھٹنے لگا۔ رات کا کھانا جلدی کھا کر حسب معمول سب گھر والے چھت پر آ کر لیٹ چکے تھے۔ جیسے جیسے رات گزرتی گئی۔ ہوا بھی چلنے لگی اور فضا میں طاری حبس بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتا گیا اور ٹھنڈ بڑھتی چلی گئی۔ وہ لوگ رات کو سردی لگنے پر نیچے اتر آتے تھے۔ تاشفین گہری نیند میں تھا اسے ٹھنڈ کا احساس شاید نہ ہو سکا اور باقی سب گھر والے وقتاً فوقتاً اٹھ اٹھ کر نیچے برآمدے میں جا کر لیٹ گئے۔

جس وقت وہ اچانک جاگا تو خود کو لمبی چوڑی چھت پر تنہا لیٹے ہوئے پایا۔ اس کا بستر شبنم کی وجہ سے نم ہو چکا تھا اور سردی رگ و پے میں سما رہی تھی۔ لیکن تاشفین کا دھیان خواب کے بعد اس پراسرار روشنی پر اٹک گیا تھا جو آسمان پر نظر آ رہی تھی۔ مدھم ستاروں کے درمیان وہ ایک روشن ستون سا تھا جو نیچے اتر تا آ رہا تھا۔

گرمیوں میں جب وہ لوگ کھلے آسمان تلے لیٹتے تھے تو تاشفین نے اکثر آسمان پر تیز رفتار روشنیاں دیکھی تھیں جو اچانک نمودار ہوتیں اور پھر فوراً سے غائب ہو جاتی تھیں۔ سنا تھا کہ جب شیطان آسمان کا رخ کرتا ہے تو فرشتے اسے اوپر نہیں آنے دیتے اور اسے مارتے ہیں جس کی وجہ سے وہ پراسرار روشنیاں پیدا ہو کر ہمیں نظر آتی ہیں اس موقع پر سب گھر والے لاحول ولاقوۃ پڑھتے تھے۔ بعض لوگ کہتے کہ ستارے ٹوٹنے پر برق رفتار روشنیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اب حقیقت کیا ہے یہ تو رب ہی جانتا ہے لیکن اس رات دکھائی دینے والی نیلی طویل روشنی کہیں غائب نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ متواتر نظر آتی رہی اور اس کا زمین سے فاصلہ ہر گزرتے لمحے کم سے کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شاید وہ کسی ٹوٹے ستارے کا حصہ تھا جو زمین پر گر رہا تھا۔

جیسے جیسے وہ قریب ہوتا گیا۔۔۔ روشنی بڑھتی گئی۔۔۔ اور پھر مشرقی افق یوں روشن ہوا جیسے کئی سورج ایک ساتھ طلوع ہو گئے ہوں۔۔۔ لیکن ایسا صرف چند سیکنڈز کے لیے ہوا تھا۔ ہلکے دھماکے کے ساتھ وہ روشنی سانپوں والے ٹیلے کے عقب میں غائب ہو گئی تھی۔

سب پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ خاموش اور ساکن۔ ان کے گھر کے سامنے ایک کلومیٹر دور ریت کا ایک تین سو فٹ بلند ٹیلہ تھا، اسے سانپوں والا ٹیلہ کہا جاتا تھا کیوں کہ اس پر لوگوں نے اکثر دن میں بھی سانپ رینگتے دیکھے تھے۔ صحرا میں چھپکلیاں، بچھو اور سانپ عام پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس ٹیلے پر سانپ کچھ زیادہ ہی تھے تب ہی وہ ٹیلہ اتنا مشہور ہو گیا تھا۔ سانپوں کے خوف سے اس ٹیلے پر کوئی بھی نہیں جاتا تھا۔ ستارے کا ٹکڑا اسی ٹیلے کے قریب گرا تھا۔ تاشفین نے اگلی صبح اس ٹیلے پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخری تاریخوں کا زرد سا چاند آسمان کے مغربی حصے میں اٹکا تھا۔ رات خاموش تھی اور لوگ نیند کی آغوش میں تھے۔ اسے امید تھی اس سنسان علاقے میں میرے علاوہ کسی اور نے اس روشنی کو زمین پر آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ تاشفین نے اپنا بستر سمیٹا اور سیڑھیاں اترتا نیچے آ گیا۔

☆

صبح تک تاشفین اس واقعے کو بھول جاتا اگر ابا سانپوں والے ٹیلے کا ذکر نہ کرتا۔

"کل دن میں سانپوں والے ٹیلے کے قریب ایک ناگ نے بکری کو ڈس لیا۔ بھائی رمضو کی بکری موقع پر ہی مر گئی تھی۔ بے چارہ بہت غمگین تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو منع کر رکھا تھا بکریوں کو اور خود کو سانپوں والے ٹیلے سے دور ہی رکھے۔ لیکن نا سمجھ بیٹا کھیل کود میں الجھ کر سانپوں والے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا۔ جب بکری درد کے مارے چیخی تب لڑکے کو خبر ہوئی کہ سانپ اسے ڈس کر نکل چکا ہے۔" ابا چولہے پر بیٹھا اماں کو بتا رہا تھا۔

"یا اللہ! رحم بہت نقصان ہو گیا رمضان بھائی کا۔ بکری ہزاروں روپے کی ہوگی۔"

"اللہ صبر دے اسے" اماں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

تاشفین نے سانپوں والے ٹیلے کا ذکر سنا تو فوراً اس کے ذہن میں رات والی نیلی روشنی گھوم گئی جو اسی ٹیلے کے عقب میں غائب ہوئی تھی۔

ناشتے کے بعد اس نے دوست کے پاس جانے کا بہانہ کیا اور چھپتے چھپاتے اس ٹیلے کی طرف چل دیا۔

کچھ دیر بعد وہ ٹیلے کے سامنے تھا۔ اوپر چڑھنے کے بجائے وہ گھوم کر اس کی دوسری سمت جانے لگا۔ دور دور تک اس وقت کوئی نہ تھا۔ جنگلی بیری کے چھوٹے چھوٹے جھاڑی نما درخت اور خودرو جھاڑیاں چاروں طرف پھیلی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کی آوارہ ٹولیاں سرگشت کر رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں تاشفین کو تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ طویل چکر کاٹ کر وہ دوسری جانب پہنچ گیا۔ وہاں جاتے ہی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔

ریت میں کئی فٹ گہرا گڑھا بنا ہوا تھا جو کافی چوڑا تھا۔ تاشفین ادھر ادھر دیکھتا ہوا محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ دھیرے دھیرے وہ گڑھے کے کنارے آ گیا۔ اس نے اندر جھانکا۔

گڑھے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بالکل خالی تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ جو چیز آسمان سے گری وہ گڑھے سے کہاں چلی گئی۔ بھلا چٹان بھی گڑھے سے نکل کر بھاگ سکتی ہے کیا؟" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

تاشفین کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی۔

وہ گڑھے کے کنارے پھرنے لگا۔ اس کی نظریں کوئی نہ کوئی ایسی شے تلاش کر رہی تھیں جس سے اسے اندازہ ہو سکتا کہ رات کو واقعی کوئی شہاب ثاقب گرا تھا یا وہ سب اس کا وہم تھا یا خواب؟

اس نے ایک بار پھر آس پاس کا جائزہ لیا تو ایک اور انکشاف ہوا۔ گڑھے ایک

طرف سے مٹی سے بھرا تھا۔ یوں جیسے کسی شے نے گڑھے کو مٹی سے بھرنا چاہا ہو لیکن پھر وہ کام ادھورا چھوڑ کر بھاگ گئی ہو۔

"ہیلو! چھوٹے دوست۔ کیا دیکھا جا رہا ہے؟" اچانک ایک تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

تاشفین ڈر کے مارے اچھل پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

شایان صدیقی ایک جھاڑی کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"کچھ بھی نہیں بس اس گڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ کل تو نہیں تھا۔ راتوں رات خدا جانے کیسے بن گیا" تاشفین نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹا جی! یہ صحرا ہے۔ یہاں ریت کے ٹیلے مسلسل اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ جہاں ٹیلہ ہو وہاں گڑھا بن جاتا ہے اور گڑھے کی جگہ بلند ٹیلہ۔ یہ تو صحرا کا قانون ہے۔"

"ہاں! شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" تاشفین پھیکا سا مسکرایا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ کچھ مدد چاہیے تو بتائیں؟"

"چند جڑی بوٹیاں لانے کا بولا تھا پروفیسر صاحب نے۔ بس صبح سویرے انھیں ڈھونڈنے آ گیا، کچھ مل گئی باقی تلاش کر رہا ہوں اگر تم مدد کرنا چاہو تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔" شایان صدیقی نے ہاتھ میں پکڑا تھیلا کھول کر دکھایا۔ اس میں کچھ صحرائی بوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

وہ بتا کر گڑھے کی مخالف سمت جانے لگا۔ تاشفین بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ تاشفین کو پیچھے آہٹ سی سنائی دی۔ اس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ گڑھے کے قریب جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔

"شاید کوئی جانور ہے، یا زہریلا سانپ"

"پروفیسر صاحب کیسے ہیں؟" اس نے چلتے چلتے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

"بہت اچھے ہیں۔ تمھیں یاد کرتے ہیں۔ کبھی چکر لگا نہ ہمارے ہاں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں آج ہی چلو۔ چائے ساتھ پی لیں گے۔ بے چارے پروفیسر کسی سے دو گھڑی بات کرنے کو ترستے رہتے ہیں۔ تم جاؤ گے تو وہ بہت خوش ہوں گے" شایان بولا۔

"جیسے آپ کہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

ایک سال قبل گاؤں سے ذرا دور ویران صحرا میں پروفیسر رفیق نے ایک عمارت بنوائی تھی۔ بقول ان کے گورنمنٹ نے ریسرچ سینٹر قائم کیا تھا جہاں پروفیسر صاحب صحرائی علاقے میں موجود قدرتی جڑی بوٹیوں پر تحقیقات کر سکیں۔ عمارت کا سارا خرچہ حکومت نے کیا تھا۔ اندر مختلف ہال کمرے تھے جن میں کروڑوں مالیت کی مہنگی ترین مشینری موجود تھی جو تحقیقات میں مین کردار ادا کرتی تھی۔ گول گنبد نما وہ عمارت مٹیالے رنگ کی تھی۔ جہاں عمارت تھی اس علاقے میں شاذ و نادر ہی کوئی جاتا تھا۔ پروفیسر صاحب اور ان کا اسسٹنٹ شایان صدیقی ہی وہاں ہوتے تھے۔

ایک سال تک تو عام لوگ عمارت کے پاس پھٹکے تک نہیں۔ گاؤں کے لوگوں نے اس عمارت کا نام گول کوٹھی رکھ دیا تھا۔

سال بعد پروفیسر صاحب اور شایان صدیقی گاؤں آنے جانے لگے۔ کبھی تازہ مکھن لینے، کبھی دودھ، کبھی سبزیاں، اور یوں آہستہ آہستہ وہ گاؤں والوں سے گھل مل گئے۔ سب کو یہی معلوم تھا کہ وہ حکومت کے سائنس دان ہیں اور ہمارے علاقے میں اپنے کام کے لیے آئے ہوئے ہیں، صحرائی بوٹیوں پر غور و خوض کر کے وہ ان سے دوائیاں بناتے ہیں۔"

تاشفین اور اس کے ہم عمر لڑکوں کو شایان صدیقی کبھی کبھار کوئی نایاب بوٹی ڈھونڈنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

تاشفین پہلی بار گول کوٹھی گیا تو حیران رہ گیا۔ وہ تو ایک الگ ہی دنیا تھا جہاں مشینوں کے بیچ گوشت پوست کے صرف دو انسان رہتے تھے۔ چم چم کرتا فرش، لمبی راہداریاں، طویل ہال، عجیب و غریب مشینیں، پوری عمارت یخ ٹھنڈی تھی اور باہر کی کوئی آواز اندر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تاشفین نے ایسا ماحول آج تک صرف فلموں ڈراموں میں ہی دیکھا تھا۔ شایان صدیقی اس دن اسے پہلی بار اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ گاؤں کے دوسرے اجڈ بچوں میں ذرا تیز طرار تھا۔ پروفیسر صاحب اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور اسے دوبارہ آنے کی تاکید بھی کی تھی۔

بعد میں تاشفین کئی بار گول کوٹھی گیا تھا۔ پروفیسر صاحب اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔

"اور سناؤ کیا کر رہے ہو آج کل؟" چلتے چلتے شایان صدیقی نے پوچھا۔

"بس اسکول اور گھر کے کام کاج" اس نے ایک جھاڑی کے پتوں کو چھیڑتے ہوئے کہا جو راستے میں آ گئی تھی۔

ساتھ ساتھ چلتے تاشفین کو بار بار محسوس ہوا جیسے شایان صدیقی اسے پرسوچ نظروں سے گھور رہا ہو۔ جب تاشفین اس کی جانب دیکھتا تو شایان کا چہرہ دوسری جانب ہوتا۔

"ہو سکتا ہے شہاب ثاقب کو گرتے دیکھنے والا میں اکیلا نہ ہوں۔ شایان نے بھی اسے دیکھا ہوگا۔ اور میری بات پر اس نے ابھی تک یقین نہیں کیا کہ میں ویسے ہی گڑھے کے اتنے قریب موجود تھا، شاید تب ہی بے یقینی سے بار بار مجھے دیکھ رہا ہے" اس نے سوچا۔

"اچھا یہ تصویر غور سے دیکھ لو۔ ہمیں اس جیسے پانچ چھ پھول تلاش کرنے ہیں" اس نے موبائل پر ایک تصویر تاشفین کو دکھائی۔

تین پتیوں والے وہ نیلے رنگ کے پھول تھے۔

"میں نے کسی جھاڑی پر ایسے پھول کبھی نہیں دیکھے"

بقیہ صفحہ نمبر: 42

منّو کی نانی بڑی سیانی

روبینہ کبیر خان

منّو کی آنکھوں میں سرمہ لگانے کو اس کی نانی سبز پری نے سرمہ دانی اٹھائی اور بڑے پیار سے سلائی کو ہلکے سے جھٹکا تاکہ زائد سرمہ گر جائے مگر چاندی کی سلائی تو سفید کی سفید رہی۔ سبز پری نے کچھ حیرت سے سلائی کو غور سے آنکھوں کے قریب لا کے چیک کرنے کی کوشش کی مگر کچھ صاف دکھائی نہ دیا۔ اصل میں تو سبز پری کی آنکھیں کمزور ہو چکی تھیں، مگر وہ چشمہ پہننا پسند نہیں کرتی تھی۔ سرمہ دانی کو ہلانے سے اندازہ ہوا کہ وہ تو بالکل خالی تھی۔ عین اسی وقت اس کی نظر منّو کے پنگھوڑے کے پیچھے بڑی سی کھڑکی پہ پڑی۔ سامنے ہی اس کی پالتو بکری کا بچہ چھلانگیں لگا لگا کے ماں کا دودھ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ چٹے سفید میمنے کے جسم پر اس وقت بڑے بڑے سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ سبز پری کو لگا پاس کی بلڈنگ کا کوئی شریر جن ان کو تنگ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ویسے بھی کالونی کا کرایہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے کوہ قاف کے باقی باشندے مثلاً دیو، جن، چھلاوے، پریاں اور پری زاد ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ۲۰۷۵ کے کوہ قاف میں جہاں دماغ میں آنے والے خیال کی بجا آوری کے لیے خودکار آلات اور روبوٹ عام زندگی کا حصّہ تھے، وہاں آج بھی سبز پری اپنے قدیم اڑن کھٹولے اور جادو کی چھڑی سے پیچھا چھڑانے کو تیار نہ تھی۔ کوہ قاف کی نئی نسل شاپنگ کے لیے ویک اینڈ پر مریخ اور عطارد پر پہنچ رہی تھی جبکہ سبز پری کی پوری کوشش ہوتی کہ کوہ قاف اور زمین کی سرحد پر واقع خالو دیو کی دکان سے سودا لے۔ ان ساری باتوں کے ساتھ سبز پری کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی تھا، وہ بلا کی کنجوس تھی۔ ہوا میں اڑنے والی گاڑیاں، اور ٹھیلے وغیرہ پانی سے تو چلتے نہیں تھے۔ شمسی توانائی بھی مفت نہیں رہی تھی۔ روز رات کی آٹومیٹک بارش، اس پانی کی ری سائیکلنگ، سڑکوں اور گھروں کی چھتوں کی صفائی کے لیے جہازی سائز کے ویکیوم کلینر جیسی ڈھیر ساری چیزوں کو چلانے کے لیے

ڈیجیٹل ادائیگی کی ضرورت پڑتی تھی مگر کرپٹو کرنسی کے زمانے میں سبز پری قدیم انگیٹھیاں اور چوتیاں چلانے کی کوشش کرتی تھی، جس کا انجام ہمیشہ لڑائی ہوتا۔ سبز پری کو کوہ قاف میں سوائے اپنی بچپن کی دوست نیلی پری کے کسی پہ اعتبار نہیں تھا۔ وہ اپنی خوراک اپنے آنگن میں اگاتی تھی۔ پرانے ٹوٹکوں اور جھاڑ پھونک سے کام چلانے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے نئی چیزیں اور نئے اصول بہت برے لگتے تھے۔ وہ اپنی پرانی اور دقیانوسی زندگی میں بہت سکون سے رہتی تھی اور تبدیلی کو بہت ناپسند کرتی تھی۔ نیلی پری جو کہ منو کی دادی بھی تھی، سبز پری کو سمجھا سمجھا کے تھک چکی تھی کہ وقت کے ساتھ چلنا زندگی کو آسان بنا دیتا ہے، مگر سبز پری ایسی باتیں ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے نکال دینے کی عادی تھی۔ خیر، تو ذکر ہو رہا تھا سفید مکھے کے چتکبرا ہو جانے کا۔ اتنے میں روزانہ کی خودکار بارش کا وقت ہو گیا تھا اور پہلی پھوار کے ساتھ ہی مکھے کے سیاہ دھبے چشم زدن میں غائب ہو گئے اور وہ پہلے کی طرح چٹا سفید بارش میں کدکڑے لگانے لگا۔

سبز پری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً کھونٹی سے چھتری پکڑی اور کھڑکی ہی سے ہوا میں اُڑتی مکھے کے سر پہ جا پہنچی۔ ابھی وہ ۶ فٹ کی بلندی پہ کسی پتنگ کی طرح چکر کاٹ ہی رہی تھی کہ سامنے سے نیلی پری اپنی لیٹسٹ ماڈل کی شتر مرغ کی شکل کی سپیس کار میں ہلکورے لیتی نظر آئی۔ پل بھر میں نیلی پری سبز پری کے سامنے موجود تھی۔ کار کو اس نے انگلی کے اشارے سے تہہ کر کے اپنے بٹوے میں رکھ لیا تھا۔

"کتنی دفعہ کہا ہے، ان موئی مشینوں کی بجائے اپنے پر استعمال کیا کرو۔ اب پریوں پہ اتنا برا وقت آ گیا ہے کہ انہیں اڑنے کے لیے شتر مرغوں کا سہارا لینا پڑے۔" سبز پری نے منہ بنا کے سمدھن کو دیکھا۔

"ارے بھئی! یہ تو نیا رواج ہے، فیشن بھی کسی چڑیا کا نام ہے، ویسے بھی میں نے آج ہی پروں کی ٹرمنگ اور پالش کروائی ہے، تیز ہوا میں اڑ کے میں انھیں گندا تو کرنے سے رہی۔" نیلی پری نے پیار سے اپنے پروں پہ ہاتھ پھیرا۔ سبز پری نے بے ساختہ اپنے پروں پہ ایک نظر ڈالی جو بہت چھدرے اور میالے ہو چلے تھے۔ "مگر تم اس وقت بارش میں گھر سے باہر کیا کر رہی ہو؟" جواباً سبز پری نے سر جھٹک کے نیلی پری کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔ نیلی پری بہت مدبرانہ انداز میں اس کی بات سن کے سر ہلاتی رہی اور گہری سوچ میں پڑ گئی۔ یہ ایکٹنگ بہت ضروری تھی ورنہ اس کو فوراً شبہ ہو جاتا کہ اس واردات کے پیچھے ساس بہو یعنی نیلی پری اور سنہری پری کا ہاتھ ہے۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ ڈاکٹر کے مطابق سرمے میں (lead) سیسہ ہوتا ہے۔ جو بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے مضر ہوتا ہے مگر سبز پری بضد تھی کہ سرمہ لگانے سے آنکھیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ تب تھک ہار کے پوتے کی بھلائی کے لیے نیلی پری کو بچپن کی سہیلی سے غداری کرنی پڑی۔ اس نے ذروں کے ذریعہ خفیہ طریقے سے سرمہ دانی وہاں سے اٹھوائی اور گھبراہٹ اور جلدی میں اسے کھڑکی کے باہر ہی خالی کر دیا۔ مینا اس وقت وہیں کھیل رہا تھا۔ سارا سرمہ اس پر گر گیا۔ اس دن تو خیر کسی نہ کسی طرح نیلی پری اور سنہری پری نے سبز پری کا غصہ ٹھنڈا کیا مگر یہ معاملہ دن بہ دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ سبز پری کا نواسہ منو ایک بہت ہی گولو مولو سا ننھا دیو تھا جس کو ننھیال سے ورثے میں خوبصورت پر ملے تھے۔ یہ منو کی ایک سو پچیسویں سالگرہ کا ذکر ہے کہ سبز پری جلدی جلدی تیار ہو رہی تھی۔ نیلی پری کی دیکھا دیکھی اس نے اپنے آپ کو اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی ٹھانی۔ جگو جن کی پنساری کی دکان سے اپنے پروں کو پالش کرنے کے لیے اس نے روغن چگادڑ اور چھچھوندر کا جیل خریدا۔ سبز پری کی پردادی اکثر وہاں سے اپنی خوبصورتی کو بڑھانے کے لیے جڑی بوٹیوں کے عرق خریدا کرتی تھی۔ آج کا دن منو کا تھا اور سبز پری سب سے زیادہ خوبصورت نظر آنا چاہتی تھی۔ کئی گھنٹوں کی مالش کے بعد سبز پری کے دونوں پر خاصی بہتر حالت میں آ گئے۔ چھچھوندر کا جیل بالوں کے لیے تھا۔ سبز پری نے رسالے میں دیکھ دیکھ کے مور کی کلغی کی طرح کا ہیئر سٹائل بنایا اور سالگرہ میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اپنے شوہر گولو دیو کا انتظار کرتے کرتے سبز پری تھک گئی مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تھک ہار کے اس نے اکیلے ہی جانے کی ٹھانی۔ اڑن کھٹولہ کوئی ایک صدی پہلے کا خراب پڑا تھا ورنہ اسی میں چلی جاتی۔ گھر کے سامنے فضاؤں میں پرستان کی شٹل سروس جاری تھی مگر سبز پری اپنے نام کی ایک تھی۔ پہلے ہی منو کے گفٹ کے لیے بہت ہمت کر کے سنہری پری کے بچپن کا سنبھالا ہوا جھنجھنا نکال کے پیک کیا تھا کرائے کی رقم نکالنے سے پہلے تو اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا تھا۔ منو کے گھر تک دس منٹ کا راستہ تھا مگر راستے میں بارش اور پھر نظر کمزور ہونے کی وجہ سے سبز پری چھلاووں کے محلے میں جا نکلی، وہاں ان شرارتی بچوں نے سبز پری کو بھولے دے دے کے چکرا دیا۔ مگر سبز پری نے منو کا تحفہ ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ گرتے پڑتے جب سبز پری آخر کار نواسے کی سالگرہ میں پہنچی تو منو نانی کا انتظار کرتے کرتے سو چکا تھا اور تمام مہمان جمائیاں لے رہے تھے۔ سامنے سے اچانک جب سبز پری نمودار ہوئی تو مہمانوں کی چیخیں نکل گئیں۔ نیلی پری منو کو اٹھا کے اندر کو بھاگی۔ لوگ سمجھے کہ کوہ قاف کے باہر سے کسی بلا نے حملہ کر دیا ہے۔ گولو دیو نے بلا کو مارنے کے لیے آسمانی بجلی کا ترشول اٹھایا ہی تھا کہ بلا کے ہاتھ میں پکڑا گفٹ ریپ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ اس نے پل بھر کو تھم کے دیکھا تو گیلے چپچپے مردہ چمگیلی کی طرح لٹکے پروں اور سر کے بائیں جانب گری کلغی میں سے ایک جانا پہچانا چہرہ جھانک رہا تھا۔ اتنے میں ماں کو پہچان کے سنہری پری بھی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔ سبز پری نے بغیر کچھ کہے تحفہ بیٹی کی طرف بڑھایا جس نے اسے تھامتے ہی ایک زوردار چیخ ماری۔ ایک موٹا تازہ چوہا گفٹ پیک سے نکل کے سنہری پری کی آستین میں گھس گیا تھا۔ سبز پری نے دل پہ ہاتھ رکھ کے چیخ ماری۔ "ہائے میرا جھنجھنا!" اور غم سے بے ہوش ہو گئی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ سبز پری کسی بھی سالگرہ میں چلی تو جاتی ہے مگر تحفہ لے کے نہیں جاتی۔ ☆

میٹھے سیب

حافظ محمد احمد

اکبر پور کے گاؤں میں ایک آدمی رہا کرتا تھا۔ وہ بہت ہی معصوم اور بے حد کنجوس تھا۔ اس کی کنجوسی پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ گاؤں میں اس سے بڑا کوئی اور کنجوس نہ تھا، اور اسے اس بات پر بے حد فخر تھا۔ گاؤں کے اکثر لوگ اس کے پاس کنجوس بننے کے لیے آتے جاتے تھے وہ انہیں کنجوس بننے کے نت نئے طریقے بتاتا اور یوں وہ پورے گاؤں میں پروفیسر کنجوس کے نام سے مشہور ہو گیا لیکن اس کا اصل نام پیوش شاہ تھا۔

......☆......

ایک دن وہ اپنے غریب خانے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کتاب اس کے پاس کہاں سے آئی کچھ معلوم نہ تھا بس وہ پڑھ ہی رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پڑھا لکھا بھی نہ تھا۔ لیکن پھر بھی کتاب پڑھ رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کنجوسی کے نت نئے طریقے ڈھونڈ رہا ہو۔

اچانک دروازہ زور سے کھلا وہ بغیر دیکھے چیخ اٹھا'' اور غصے سے بولنے لگا۔

''یہ میرے پردادا کی نشانی ہے اگر یہ دروازہ ٹوٹ گیا تو تمہارا باپ بنوائے گا۔''

وہ سمجھا کہ اس کا چھوٹا بیٹا ہے۔ لیکن جب اس نے اپنی آنکھیں کتاب سے ہٹائیں تو اس کے چہرے سے پسینہ ٹپکنے لگا سامنے بیگم کھڑی اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ ''بچو!! آج تو تیری شامت آگئی۔''

میاں کنجوس بڑبڑاتے ہوئے بولے۔

''ہاں بیگم! آپ کو کوئی کام ہے؟'' میاں کنجوس نے منمناتے ہوئے پوچھا۔

''میرا دل کر رہا ہے کہ میں تازہ سیب کھاؤں۔'' بیگم نے خواہش کا اظہار کیا۔

پروفیسر کنجوس کافی دیر بیگم کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

''بیگم! آپ کو تو معلوم ہے کہ حالات بہت خراب ہیں لوگوں کے گھروں میں فاقے ہیں اور آپ سیب کھانے کی خواہش کر رہی ہیں۔''

پروفیسر کنجوس نے اداس لہجے میں کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی سیب لے کر آنا ورنہ تمہاری خیر نہیں۔'' وہ پروفیسر کنجوس کو سرعام دھمکی دیتے ہوئے چلی گئی۔

ادھر پروفیسر کنجوس کا برا حال تھا۔ ہچکیاں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ پروفیسر کنجوس زمین پر پڑے تھے۔ اچانک انہیں ٹھنڈے پسینے آنے لگے، وہ ایک لمحے کے لیے چونکے، انہیں وہ دن یاد آگیا۔ جب ان کی بیوی نے فرمائش کی تھی، اور وہ اسے پورا کرنے میں ناکام رہے تو سزا کے طور پر ایک دن باہر رہنا پڑا اور ساتھ میں کھانا بھی کم ملنے لگا یہ سوچتے ہوئے وہ اٹھے۔ قریب پڑے صندوق کے پاس جا بیٹھے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

''میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ جب تک میں بوڑھا نہ ہو جاؤں تب تک تمہیں نہیں کھولوں گا تم سمجھ سکتے ہو۔ حالات بہت نازک ہیں'' پروفیسر کنجوس کافی دیر وہیں بیٹھے صندوق سے باتیں کرتے رہے۔ پھر اپنا ہاتھ صندوق کی جانب بڑھایا، کچھ نوٹ بڑے فخر سے اپنی جیب میں رکھے اور صندوق بند کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ بیگم کا چہرہ دیکھ کر انہیں خوف آنے لگا۔ وہ بیگم کو تسلی دیتے ہوئے بولے:

''میں ابھی بازار جا رہا ہوں وہاں سے تمہارے لیے تازہ میٹھے سیب لے کر آؤں گا۔''

بیگم کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑی تو پروفیسر کنجوس کو تھوڑا سا اطمینان ہوا لیکن وہ غم زدہ تھے۔ ہوتے کیوں نہ آخر اتنی بڑی قربانی دینے جا رہے تھے۔

☆

خیر بازار میں پہنچے، بازار مکمل طور پر گرم تھا مطلب یہ کہ اشیاء کے نرخ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ ایک ریڑھی والے کے پاس جا کر پروفیسر کنجوس نے سیب کا ریٹ پوچھا۔ ''تین سو روپے کلو عمدہ اور میٹھا سیب ہے'' ریڑھی والے نے سیبوں کی تعریف کرتے ہوئے ریٹ بتایا۔

''بھائی اللہ! اکرو'' پروفیسر کنجوس کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔''

''ارے میرے پیارے بھائی! یہ سیب اتنے مہنگے کیوں بیچ رہے ہو تھوڑا کم کرو انہوں نے ریڑھی والے سے التجا کی۔''

''نہیں بھائی اس سے کم نہیں ہو سکتا، پہلے ہی بہت مہنگا ملا ہے'' اس نے وجہ بتاتے ہوئے پروفیسر کنجوس کو انکار کر دیا۔

''آگے سے پوچھ لو! شاید وہاں سے سستا مل جائے'' اس نے آگے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''

پروفیسر کنجوس تیزی سے آگے بڑھے ان کا اگلا ہدف دوسری ریڑھی والا تھا۔

''ہاں میاں! یہ سیب کیا کلو ہیں؟'' پروفیسر کنجوس مدہوشی کے عالم میں بولے۔

''جناب! آپ کے لیے صرف تین سو دس روپے کلو، باقیوں کے لیے ساڑھے تین سو روپے کلو ہیں۔'' ریڑھی والے نے ریٹ بتائے۔

''تو میرا ماما لگتا ہے جو اتنی رعایت کر رہا ہے'' وہ طنزیہ انداز میں بولے۔

ریڑھی والا ایک لمحے کے لیے بوکھلا گیا۔

''میاں! اللہ کا نام مانو تم تو سیب سونے کے بھاؤ بیچ رہے ہو۔''

''نہیں کم ہو سکتا ریٹ، لینے ہیں تو لو ورنہ جاؤ یہاں سے۔'' اس نے پروفیسر کنجوس کو غصہ دلا دیا۔

''وہ بولے: بندے کے اندر کوئی شرم، کوئی حیا، کوئی غیرت، کوئی تمیز، کوئی مروت بھی ہوتی ہے۔ جو مجھے تمہارے اندر بالکل بھی نظر نہیں آئی'' وہ ہنستے مسکراتے وہاں سے آگے چل دیے۔ ریڑھی والا منہ ہی دیکھتا رہ گیا۔

''یہ سیب کیا کلو ہیں؟'' انہوں نے اگلی ریڑھی والے سے پوچھا۔

سیبوں کی حالت بھی کیا خوب تھی۔ گلے سڑے پڑے تھے جن میں رس کا کوئی نام و نشان نہ تھا، ہزاروں مکھیاں ان پر بھنبھنا رہی تھیں۔ پروفیسر کنجوس ریڑھی والے سے بولے:

بھیا! کیا یہ سیب مفت دستیاب ہیں'' انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا؟

''نہیں جناب! کیا بات کرتے ہیں۔ پچاس روپے کلو ہیں'' ریڑھی والے نے کہا۔

پروفیسر کنجوس غصے سے تلملا اٹھے اور ریڑھی والے کو ایک گھونسہ دے مارا:

''اپنی شکل دیکھی ہے تم نے سیب بیچ رہے ہو۔''

وہ غصے سے بولے:

''چوہے جیسی شکل اور مفت سیب'' وہ آگے جانے لگے، ریڑھی والے کو بھی بہت غصہ آیا اس نے کہا:

''میاں صاحب آپ نے اگر قبری لینے ہیں تو بتائیں۔''

''ہاں بیٹا! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے اگر تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے تو تمہیں مارنا نہ پڑتی، میں پہلے ہی بلڈ پریشر کا مریض ہوں'' پروفیسر کنجوس نے کہا۔

جب وہ قریب آئے تو ریڑھی والے نے کہا۔

''میں آپ کو مفت میں دعا دے سکتا ہوں سیب نہیں۔''

پروفیسر کنجوس غصے میں ایک اور گھونسہ مارنے ہی والے تھے کہ ریڑھی والے نے کہا:

''میاں جی! بتاتا ہوں غصہ نہ کریں وہ سامنے کنواں دیکھ رہے ہو اس کے اوپر ہی سیبوں کا درخت ہے وہاں سے تازہ میٹھے سیب توڑ لو'' اس نے درخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے۔

''کیا یہ درخت تمہارا ہے؟'' پروفیسر کنجوس نے پوچھا۔

''میرے بھائی! تم آم کھاؤ گٹھلیاں نہ گنو'' ریڑھی والے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پروفیسر کنجوس دوڑتے ہوئے درخت کے پاس پہنچے تازہ میٹھے سیب دیکھ کر منہ پانی سے بھر گیا سوچنے لگے کمال ہو گیا سیب بھی مل جائیں گے اور پیسے بھی بچ جائیں گے۔

پروفیسر کنجوس درخت کے اوپر چڑھے اور لگے سیب توڑنے کہ اچانک ان کا پاؤں پھسلا اور وہ کنویں میں جا گرے۔ پھر وہ اٹھے اور زور سے چیخنے لگے۔

''ہے کوئی میری مدد کرنے کے لئے، یا سب کے سب مر گئے ہیں۔''

''مجھے بچاؤ!! میں یہاں ہوں'' وہ اور زور سے چلائے۔

ادھر سے ایک گدھا گاڑی والا گزرا اس نے آواز سنی اور مدد کے لیے رسہ نیچے پھینکا۔

''میں رسی کو اوپر کھینچتا ہوں تم رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو'' وہ بولا۔

ابھی پروفیسر کنجوس تھوڑا ہی اوپر آئے تھے کہ گدھا گاڑی والا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے پروفیسر کنجوس کے اوپر جا گرا۔

پروفیسر کنجوس چیخ اٹھے ”کمبخت اکم توڑ دی میری؟ آخر تو ادھر آیا ہی کیوں؟ نہ آتا تو اچھا ہوتا“ پروفیسر کنجوس اسے طعنے دینے لگے۔ وہ زور سے ہنستے ہوئے بولا!

”کنویں سے نکلا گدھے میں اٹکا“

پھر کیا تھا دونوں شور مچانے لگے اور دونوں نے پورا گاؤں سر پر اٹھا لیا۔

ادھر سیب کے درخت کا مالک بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے کہا!

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ حیران تھا۔

پروفیسر کنجوس نے اسے ساری بات بتائی وہ بولا:

”اگر میں تمہیں یہاں سے نکالوں تو مجھے کیا ملے گا؟“

پروفیسر کنجوس بولے: ”تمہیں دو سو روپے ملیں گے۔“ مالک نے ان دونوں کو باہر نکالا اور اپنا انعام مانگنے لگا۔ پروفیسر کنجوس نے جاتے ہوئے کہا:

”میں تمہیں پیسے دے چکا ہوں تمہارے درخت نے مجھے نیچے گرا دیا پھر اس بھلا مانس گدھے والے کو بھی گرا دیا۔ تمہارے درخت کی وجہ سے ہم زخمی ہوئے ہیں اور تم الٹا ہم سے پیسے مانگ رہے ہو تمہیں شرم نہیں آتی؟ ہمیں جو چوٹ لگی ہے اس کے علاج اور دوائی کے پیسے کون دے گا بتاؤ مجھے؟“

سیب کے درخت کے مالک نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔

اب وہ گدھے والے سے لفٹ لے کر بغیر پیسے ضائع کیے مسرور ہو کر گھر چلے گئے۔ وہ گھر تو چلے گئے مگر گھر پر تو بیگم بھوکی شیرنی کی طرح سیبوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی وہ گدھا گاڑی سے اترا بھی نہ تھا کہ بیوی بھاگ کر اس کے پاس آئی اور بولی:

”سیب کہاں ہیں؟“

”بیگم! بات یہ ہے ہوا کچھ یوں، معاملہ ایسا تھا کہ، میرا مطلب تم کہہ سکتی ہو، آپس کی بات ہے“ اس نے ٹال مٹول کرتے ہوئے کہا۔

بیگم سخت لہجے میں بولی۔

”میرے تازہ میٹھے سیب کہاں ہیں؟“ اس نے پھر کراہتے ہوئے کہا۔

”بھائی! تم ذرا اپنی بھابی کو بتاؤ! آج ہمارے ساتھ کیا مسئلہ پیش آیا۔“

بیوی نے کہا کہ:

”بھاڑ میں جاؤ تم میرے سیب لائے ہو کہ نہیں؟“ پروفیسر کنجوس نے تقریباً پانچ منٹ کی خاموشی کے بعد کہا:

”نہیں!“

بس پھر کیا تھا بیوی کے ہاتھ میں جو کچھ آیا دے مارا۔

اس کے بعد گدھے والا یہ سب عالم دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ

”کنجوس کی عزت گدھے سے بھی بدتر ہوتی ہے۔“ ☆

بقیہ: اڑن طشتری کا تجربہ

”یہ پھول اسی مہینے میں بارش کے بعد کھلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم دیکھ چکے ہو لیکن اب یاد نہ ہو“ شایان نے اپنی بات پر زور دیا۔

وہ آدھ گھنٹے تک ادھر ادھر پھرتے رہے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

”چلو واپس چلتے ہیں۔ شاید تم صحیح کہہ رہے تھے“ اور دونوں واپس چل دیے۔

گیلی ریت سورج کی روشنی میں تیزی سے سوکھتی جا رہی تھی۔ ان کے جوتے ریت میں دھنسنے لگے تھے۔ جلد ہی وہ گول کوٹھی پہنچ گئے۔

تاشفین نے مڑ کر شمال کی سمت دیکھا۔ وہ پراسرار گڑھا گول کوٹھی کے بہت قریب تھا۔ ایک ٹیلہ درمیان میں حائل تھا ورنہ دونوں کے بیچ فاصلہ بہت کم رہ جاتا۔ عمارت تھوڑی بلندی پر تھی۔ وہاں سے گڑھے والی جگہ دکھائی دے رہی تھی اور اب وہاں اس گڑھے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ جگہ برابر ہو چکی تھی۔ تاشفین نے حیرانی سے دور تک پھیلے میدان کو دیکھا۔

تب ہی ایک سوچ نے اس کے دماغ میں دستک دی۔ تاشفین نے نفی میں سر ہلا کر اس سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا اور شایان صدیقی کے پیچھے عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ اندر سے بری طرح الجھ سا گیا تھا۔

☆

”آ تاشی میاں۔۔۔ بڑے دنوں بعد نظر آئے ہو“ پروفیسر صاحب ایک کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے کام کر رہے تھے۔ ان کے سامنے مختلف شیشیاں رکھی تھیں جن میں مختلف جڑی بوٹیاں تھیں۔ وہ ان شیشے کی بوتلوں میں رنگا رنگ سیال ڈال رہے تھے۔

”بس ابا نے کہا ہوا ہے گول کوٹھی زیادہ مت جایا کرو۔ تم جا کر پروفیسر صاحب کا وقت ضائع کرتے ہو جبکہ ان کا وقت بہت قیمتی ہے“ تاشفین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پروفیسر صاحب نے اس کی بات سنتے ہی قہقہہ لگایا۔

”ارے بیٹا! آ جایا کرو، دن رات کام میں ہی مصروف ہوتے ہیں۔ تم آ جاتے ہو تو باتیں کر کے دماغ کچھ فریش سا ہو جاتا ہے۔“

شایان صدیقی تھیلے کسی کمرے میں رکھ کر واپس اسی ہال میں آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کے تین ٹن تھے۔ اس نے ایک تاشفین کو دیا، دوسرا پروفیسر صاحب کو کھول کر دیا اور ایک خود منہ سے لگا لیا۔

”آپ کا یہ دوست صبح ہی صبح ویران ٹیلوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ پوچھیں ذرا اس سے“ اچانک شایان صدیقی تاشفین کو معنی خیز انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔

تاشفین کا چہرہ سفید سا ہو گیا۔ ٹھنڈی بوتل اسے اپنے گلے میں اٹکتی محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے شایان نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ ☆

کیا رونق ہے باغ کے اندر

ارسلان اللہ خان

چنّا، گڈو، ڈولی، بلی
باغ میں پہنچے جلدی جلدی

شام کا ہے یہ پیارا منظر
کیا رونق ہے باغ کے اندر

آؤ کتابیں ہم پڑھتے ہیں
ایسے آگے ہم بڑھتے ہیں

دیکھو گڈو دیکھو چنّا
پڑھنا ہے اب تم کو اردو

ٹھیک ہے پیاری ڈولی باجی
ہم پڑھ لیں گے اردو ساری

آجاؤ اب پیاری بلی
آج پڑھو گی تم انگریزی

ڈولی باجی یہ بتلائیں
آپ کے ہاتھوں میں یہ کیا ہے

میں پڑھتی ہوں ایک رسالہ
جو ہے سب کا دیکھا بھالا

اس میں ہے پریوں کی کہانی
ایک تھا راجا ایک تھی رانی

تم بھی بچّو باغ میں جاؤ
پڑھنے کو بھی کچھ لے جاؤ

جو اچھے بچّے ہوتے ہیں
باغ میں بھی پڑھتے رہتے ہیں

باغ میں کتنی ہے ہریالی
پھول کھلے ہیں ڈالی ڈالی

باغ میں جا کر جو پڑھتے ہیں
یاد سبق کو وہ رکھتے ہیں

ان چاروں پیارے بچّوں سے
سیکھو تم پڑھتے ہیں کیسے

روز کتابیں جو پڑھتا ہے
خوب ترقّی وہ کرتا ہے

انعم سہیل

شکر گزاری

سکول میں آخری پیریڈ تھا۔ ٹیچر بچوں کو کل ہونے والی پارٹی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ سب بچے بہت خوش تھے کیونکہ کل سب نے نئے کپڑے پہن کر آنے تھے اور کل کوئی پڑھائی نہیں ہونے والی تھی۔ اتنے میں مریم کی دوستوں نے مریم سے پوچھا کہ تم کل کیا پہن کر آؤ گی۔ ہم اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ کل کے لیے نیا سوٹ لینے بازار جائیں گے۔ مریم کی سب سہیلیاں امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن مریم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ وہ یہ سوچتے سوچتے گھر چلی گئی۔ گھر پہنچتے ہی مریم نے امی کو کل ہونے والی پارٹی کے بارے میں آگاہ کیا۔ مریم نے امی سے کہا:

"امی جان! کل ہمارے سکول میں پارٹی ہے میری ساری سہیلیاں نیا سوٹ پہنیں گی مجھے بھی نیا سوٹ پہننا ہے۔" اس کی امی مسکرائیں اور پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ:

"بیٹا ابھی ایک مہینے پہلے ہی تو آپ کو عید پر نیا سوٹ خرید کر دیا ہے وہ پہننا وہ بہت خوبصورت ہے دیکھنا میری بیٹی جب وہ پہن کر جائے گی کل تو گڑیا لگے گی۔" یہ سن کر مریم نے رونا شروع کر دیا اور کہا:

"نہیں امی جان! وہ پرانا ہو چکا ہے۔ میری دوستیں کل نئے نئے کپڑے پہن کر آئیں گی۔ میں وہ پرانا سوٹ پہن کر جاؤں۔ نہیں مجھے نیا سوٹ چاہیے۔ میری ساری دوستیں اپنے امی ابو کے ساتھ بازار جا کر شاپنگ کرتی ہیں اور آپ مجھے کچھ نہیں لے کے دیتی۔" یہ سن امی جان ایک دم حیران ہو گئیں۔ پھر انھوں نے مریم کو چپ کروایا اور کہا:

"بیٹا شکر کرنا سیکھو۔ اگر آپ اللہ پاک کا شکر ادا کرو گی تو وہ آپ کو اور دے گا۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو دو وقت کی روٹی کو بھی ترستے ہیں۔ آپ جو نئے کپڑے جوتے پہنتی ہو۔ اچھے اسکول میں پڑھتی ہو لوگوں کے بچے غربت کی وجہ سے سکول نہیں جاتے۔ آپ کے پاس ایک سے ایک پیارا کھلونا موجود ہے لیکن غریب لوگ اپنے بچوں کو ایسے کھلونے نہیں لے کے دے سکتے۔" پھر مریم کی امی نے مریم کو ایک بزرگ کا واقعہ سنایا کہ:

"ایک دفعہ ایک بزرگ مسجد سے باہر نماز پڑھ کر آئے تو دیکھا کہ ان کے جوتے غائب تھے وہ بزرگ اپنے دور کے بہت بڑے بڑے امام تھے جب انھوں نے دیکھا کہ میرے جوتے غائب ہیں تو ان کے دل میں شکوے کا خیال آیا کہ یا اللہ میں اپنے دور کا سب سے بڑا امام ہوں لوگ کہیں گے کہ اس کے پاس پہننے کو جوتے نہیں ہیں تو وہ آگے گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک آدمی ہے جس کے پاؤں ہی نہیں ہیں تو ان بزرگ نے اللہ

کا شکر ادا کیا کہ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میں تو ایک جوتے کی لیے تجھ سے شکوہ کر رہا تھا لیکن اس آدمی کے تو پاؤں ہی نہیں ہیں۔ جوتے پھر بھی نہ کبھی مل جائیں گے۔ لیکن میں کسی کا محتاج تو نہیں ہوں۔ یہ بات سن کر کر مریم کا دل پگھلنے لگا۔

پھر اس کی امی نے اسے مزید سمجھاتے ہوئے کہا کہ:

"بیٹا! دیکھو ایک آدمی ہے وہ ایک گاڑی پر سفر کرتا ہے باہر شدید گرمی ہے تو جب وہ آدمی گاڑی سے باہر دیکھتا ہے تو اس کو گرمی میں ایک موٹر سائیکل پر سوار شخص نظر آتا ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ میں مزے سے گاڑی میں بیٹھا ہوا ہوں مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرح گرمی میں نہیں نکلنا پڑا۔ پھر وہ موٹر سائیکل والا آدمی آگے جاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ایک آدمی سائیکل پر بیٹھا ہے اور وہ آدمی بڑی مشکل سے سائیکل پر زور لگا کر اس کو چلا رہا ہے۔ تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے موٹر سائیکل دی ہے جو خود بخود چلتی ہے اس کو زور لگا کر چلانا نہیں پڑتا۔ پھر جب وہ سائیکل پر بیٹھا آدمی آگے جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک آدمی پیدل چل رہا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ شکر ہے کہ میرے پاس سائیکل ہے کم از کم مجھے پیدل سفر کرنا نہیں پڑتا۔ جب وہ پیدل چلتا ہوا آدمی آگے جاتا ہے تو راستے میں ایک آدمی کو دیکھتا ہے کہ جس کی ٹانگیں ہی نہیں ہوتی تو اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے کہ یا اللہ تیرا شکر ہے میں بے شک پیدل ہوں لیکن اس قابل تو ہوں کے میں خود اپنی ٹانگوں پر سفر کر سکتا ہوں۔ اس بیچارے کے پاس تو ٹانگیں ہی نہیں۔ تو دیکھو بیٹا! اسی طرح اللہ پاک نے ہمیں دنیا میں کافی لوگوں سے بہتر بنایا ہے جو چیزیں آپ کے پاس ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لیے کافی لوگ ترستے ہیں اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔" پھر مریم کی امی نے اس کو ایک کاغذ اور قلم لانے کو کہا اور اس کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو چیزیں دی ہیں چاہے وہ ایک سانس ہے یا ہاتھ پاؤں ہیں وہ سب نعمتیں ایک صفحے پر لکھو۔ مریم نے باری باری سب چیزیں لکھنا شروع کی۔ اس نے پہلے سانس کا لکھا پھر ہاتھ پاؤں، اپنے اچھے اسکول، کتابیں، نئے کپڑے، اچھا کھانا ہر چیز کے بارے میں لکھا۔ اپنی تمام نعمتیں گنتی رہی اور لکھتی رہی۔ لکھتے لکھتے اس کا وہ صفحہ ختم ہو گیا۔ اس نے کہا:

"امی! یہ صفحہ تو ختم ہو گیا ہے لیکن ابھی بھی اس میں بہت سی چیزیں باقی ہیں۔"

تو مریم کی امی بولیں:

"کتنی نعمتیں ہے تمہارے پاس۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ مریم کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی اور اپنی امی سے بولی:

"امی جان عید والا سوٹ نیا ہی تو ہے ایک ہی بار پہنا ہے میں وہی پہن لوں گی۔"

دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگی۔

☆......☆......☆

بقیہ: مینار پاکستان

فہد اپنی آنکھوں کو بھی ہٹانے سے انکاری تھا۔

"لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہم ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رک سکتے یہاں۔" سر نے اسے واضح بتایا۔

"اور اگر ٹھہر جائیں۔"

"تو پھر آپ یہیں رہ جائیں گے بیٹا۔" سر نے ڈرانا چاہا۔ اتنے میں اسے کے فضل حق کی آواز سپیکر سے ابھری تو پر جوش نعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دونوں پارک سے باہر کے راستے کی طرف چل دیے۔ گزرتے ہوئے انہوں نے کچھ لوگوں کو سنا جو آپس میں اجلاس سے پہلے شہید ہونے والوں کا ذکر کر رہے تھے۔

"بشیر احمد بڑی دور سے آ رہا تھا، اس کا تو چھوٹا بیٹا بھی شہید ہو گیا۔ ننھی جان پر بہت ظلم ہوا۔"

فہد کے کانوں تک یہ بات گئی تو اسے پاکستان ہجرت کرنے والوں کی قربانیوں کا خیال شدت سے آیا۔

سر اور فہد ایک درخت کے پیچھے گئے اور آدھا گھنٹہ مکمل ہونے پر بغیر کسی بٹن کو دبائے، وہ اپنی دنیا میں واپس آ گئے۔

"فہد تم آج کا تجربہ کسی کو نہیں بتاؤ گے جب تک کہ میں اس گھڑی پر مزید تجربات نہ کر لوں۔"

سر نے اسے ضروری ہدایات دیں۔

"اوکے سر!" وہ لیب سے اپنا بستہ لیتا گھر واپس آ گیا۔

......☆......

سورج غروب ہو چکا تھا۔ فہد اپنے کمرے میں بیٹھا 23 مارچ کے لیے تقریر لکھ رہا تھا۔

"مارچ 1940 میں برصغیر کے کونے کونے سے منٹو پارک میں آئے مسلمان سچا جذبہ رکھنے والوں کی اعلیٰ مثال تھے۔"

اپنے گھر، اپنے بچے اور مال کی پرواہ کیے بغیر الگ ریاست حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہے۔ مسلمانوں کی طویل جد و جہد کا ثمر انہیں 14 اگست 1947 کو ملا تھا۔ ان کی قربانیاں ہم پر احسان ہیں۔ آج ہم وہ احسان بھول چکے ہیں۔ اگر ہمیں اُن کی قربانیوں کا احساس ہو تو ہم کبھی بھی اس پاک مٹی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ لیکن آج ایک عہد کا دن ہے کہ اپنے وطن کے لیے ہم تن، من، دھن قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اپنے وطن پر میلی آنکھ اٹھانے والے کی آنکھیں تک نوچ لیں گے۔ کیونکہ یہ وطن ہے تو ہم ہیں۔"

فہد کے کانوں میں اب بھی "قائد اعظم زندہ باد" کا نعرہ پورے جوش سے گونج رہا تھا۔☆☆

حسن عمر

احمق تاجر اور چالاک چور

بہت زمانے پہلے کی بات ہے، کسی ملک میں ایک تاجر رہتا تھا جو اپنے آپ کو بہت ہوشیار، عقلمند اور سب سے زیادہ چالاک سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک باقی سب بیوقوف تھے اور صرف وہی پورے علاقے اور پورے ملک میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ وہ جب بھی کسی سے ملتا اس کا مذاق اڑاتا اور اس سے تضحیک آمیز لہجہ میں بات کرتا۔ کوئی اس سے بات چیت کرنے لگتا تو وہ بس ایک ہی بات کہتا:

"تم سے بات کرنا فضول ہے تم کچھ نہیں جانتے، میں اپنا وقت تم جیسے احمق کے ساتھ بات کر کے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

لوگ اس کے فخر اور غرور سے بے حد خائف تھے لیکن انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا یوں جیسے انہیں یقین ہو کہ اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔

ایک روز وہ آدمی خریداری کرنے بازار گیا۔ وہاں اس کو ایک گدھا پسند آیا اور اس نے کچھ بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد وہ گدھا خرید لیا۔ اس آدمی کو وہ گدھا اس قدر پسند آیا کہ بجائے اس پر بیٹھنے کے وہ گدھے کو رسی سے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا۔

راستے میں لوگوں نے اس کو گدھے کو چلاتے ہوئے دیکھا تو سب بے حد حیران ہوئے۔ ایک آدمی نے اسے روک کر پوچھا:

"بھائی تم اس گدھے پر بیٹھ کر کیوں نہیں جا رہے ہو؟ اگر بیٹھنا ہی نہیں ہے تو تم نے یہ گدھا خریدا ہی کیوں؟"

تاجر نے اُس آدمی کو عجیب حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے افسوس بھرے انداز میں کہا:

"ایک تو میں تم جیسے احمقوں کے سوالات سے بڑا تنگ آ گیا ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو کہ میں اتنے پیارے گدھے پر بیٹھ جاؤں؟ اس کی نرم ملائم کھال میرے بیٹھنے سے خراب ہو جائے گی۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔"

وہ آدمی اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا اور بمشکل اپنی ہنسی چھپا کر وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ایک نہر کنارے تھوڑی دیر ستانے کے لئے بیٹھا اور اپنے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا اور ساتھ ساتھ گدھے کے لئے بھی چارے کا انتظام کیا۔ اس نے گدھے کو درخت کی چھاؤں میں باندھ دیا اور خود وہ دھوپ میں لیٹ گیا۔

وہاں قریب سے ہی کچھ کسان اپنے کھیتوں پر کھیتی باڑی کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ انہوں نے یہ عجیب سا منظر دیکھا تو وہ سب بھی بے حد تعجب کا شکار ہوئے۔

ایک کسان تاجر کے قریب آیا اور اس سے پوچھا:

"بھائی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

تاجر اس وقت تک اپنی آنکھیں بند کر کے تقریباً سو گیا تھا، وہ کسان کی آواز سن کر یکدم ہڑبڑایا اور اٹھ بیٹھا:

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟"

کسان نے کہا:

"بھائی! میں پوچھ رہا تھا کہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ مجھے لگ رہا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

تاجر اس کی بات سن کر تھوڑا چونکا اور اس نے کہا:

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟"

کسان اس کی بات سن کر فکر مندی سے کہنے لگا:

"تم خود اتنی تیز دھوپ میں لیٹے ہوئے ہو اور اپنے گدھے کو تم نے چھاؤں میں باندھ رکھا ہے، میں نے اس ہی لئے پوچھا، مجھے لگا تمہاری طبیعت خراب ہوگئی ہے اس لئے تم یہاں لیٹ گئے۔"

تاجر کو اس کی بات سن کر غصہ آیا اور اس نے بے حد رکھائی سے کہا:

"ایک تو مجھے ہر جگہ تم جیسے عقل سے پیدل لوگ ہی کیوں ٹکرا جاتے ہیں؟"

کسان اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا اور اس نے پوچھا:

"کیا مطلب؟ میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟"

تاجر نے اس کی بات سن کر بے حد نخوت بھرے لہجہ میں جواب دیا:

"بیوقوف انسان! اگر میں خود چھاؤں میں لیٹ جاتا اور گدھے کو دھوپ میں باندھ دیتا تو میرے اتنے حسین گدھے کی کھال جھلس جاتی اور یہ سیاہ ہو جاتا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اتنا ظالم اور خود غرض ہوں کہ اپنے گدھے کو کالا ہونے دوں؟"

کسان اس کی بات سن کر حیران رہ جاتا ہے اور وہ بھی بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پا کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ تاجر تھوڑی دیر مزید ستانے کے بعد وہاں سے نکلنے کی تیاری کرتا ہے۔ جب تاجر کسان کے ساتھ یہ بات چیت کر رہا تھا، تب جنگل میں جھاڑیوں میں تین چور چھپے ان کی بات چیت سن رہے تھے۔ وہ لوگ بھی اس تاجر کی حماقت پر ہنس رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک چور نے کہا:

"کچھ لوگ واقعی عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔ اب تم دیکھو میں کیا کرتا ہوں اس کے ساتھ، تم دونوں میرے ساتھ چلو۔"

وہ تینوں چور بے حد آہستگی سے اس تاجر کے پیچھے چلتے رہے، ایک جگہ جہاں تاجر کی نظر ہٹی اس چور نے گدھے کی رسی کھول دی اور وہ رسی اپنی گردن میں ڈال لی پھر اس نے اپنے باقی دونوں ساتھیوں سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا:

"تم لوگ اب اس گدھے کو یہاں سے خاموشی سے لے جاؤ، پھر دیکھو میرا کمال۔"

وہ دونوں چور اس گدھے کو لے کر وہاں سے چلے گئے۔ پہلا چور اس ہی طرح اپنی گردن میں رسی ڈالے تاجر کے پیچھے گھٹنوں کے بل چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد تاجر کسی کام سے رکا اور اپنے پیچھے رسی میں گدھے کی جگہ ایک آدمی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا:

"تم کون ہو؟ میرا گدھا کہاں چلا گیا؟ تم یہاں کیسے آئے؟"

وہ چور نہایت معصومیت بھرے لہجہ میں کہنے لگا:

"میں اصل میں ایک انسان ہی تھا، میں نے اپنے ماں باپ کا بہت دل دکھایا تھا تو ایک بزرگ نے مجھے بددعا دی اور مجھے گدھا بنا دیا، انہوں نے کہا کہ میں صرف اس ہی صورت میں انسان بن سکتا ہوں اگر کوئی نہایت نیک دل، بے غرض، عقلمند، دیانت دار اور ہوشیار شخص مجھے اپنا لے۔ اور آپ سے زیادہ نیک دل، عقلمند اور ہوشیار شخص بھلا کہاں ہے۔"

چور کی یہ بات سن کر تاجر کا چہرہ چمکنے لگا۔ "ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا، چلو اب تم اپنے گھر واپس چلے جاؤ اور دیکھو! آج کے بعد اپنے ماں باپ کا دل کبھی مت دکھانا۔"

چور اس کی بات سن کر شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس کو اس کے دونوں ساتھی مل گئے اور وہ تینوں خوب ہنسے۔ وہ تینوں اس گدھے کو دوبارہ اس ہی بازار میں لے آئے اور اس ہی دکاندار کو واپس بیچ دیا جس سے اس تاجر نے وہ گدھا خریدا تھا۔ انہوں نے اس دکاندار اور بازار میں موجود تمام لوگوں کو پوری داستان سنائی اور سب لوگ بے تحاشہ ہنسنے لگے یہ سوچنے لگے کہ یہ تاجر کس قدر احمق ہے۔

دوسرے روز وہ تاجر ایک بار پھر اس ہی بازار میں ایک نیا گدھا خریدنے آ پہنچا، وہاں موجود تمام گدھوں کو دیکھتے ہوئے اچانک اسے وہ گدھا بھی نظر آ گیا جو اس کے پاس موجود تھا، اس کو اچانک احساس ہو گیا کہ اس کو کسی نے بہت مہارت سے ٹھگ لیا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے کسی پر شرمندگی ظاہر نہ ہونے دی اور اس گدھے کے پاس جا کر کہنے لگا:

"لڑکے! میں نے تمہیں کل بھی کہا تھا کہ اپنے ماں باپ کا دل مت دکھانا لیکن تم باز نہ آئے، اب میں تم کو بار بار نہیں خرید سکتا ہوں۔ تمہاری یہی سزا ہے کہ تم اب گدھے کے روپ میں باقی ساری زندگی گزار دو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ آدمی گردن اکڑاتے ہوئے اور باقی سب کو حقارت سے دیکھتے ہوئے وہاں سے جانے لگا یہ سوچ کر کہ اس نے ایک بار پھر سب کو بیوقوف بنا دیا ہے، لیکن اس کے جانے کے بعد سب لوگ ایک بار پھر بے تحاشہ ہنسنے لگے۔

پیارے بچو! اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ عقلمند سمجھنے سے اکثر ہم لوگ نقصان اٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ عاجزی اور انکساری سے کام لینا چاہیے اور کبھی خود کو عقل کل نہیں سمجھنا چاہیے۔

(ماخوذ عربی ادب)

۱۔ لو بھئی جگّو میاں چوری کھاؤ آپا تارہ نے دیسی گھی سے بنی چوری جگّو میاں کے آگے رکھی۔ آہا! چوری جگّو میاں خوشی سے چلائے۔ آج مزاحیہ مشاعرہ ہے وہ سننے جانا ہے آپا تارہ اُونچا بول رہی تھی کہ چچا خواہ مخواہ بھی سن لیں جو کمرے میں گھسے مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔ ”مشاعرہ..... آؤ جگّو میاں! ہم بھی چلیں۔“ چچا بولے۔

چچا خواہ مخواہ اور جگّو میاں

چچا خواہ مخواہ گئے مشاعرے میں

عائشہ اطہر

2۔ چچا خواہ مخواہ نے سفید کرتا پاجامہ نکالا اور سیاہ ویسٹ کوٹ پہنی پیروں میں سیاہ کھسّے پہنے۔ اپنے چند بالوں کو جما جما کر بنایا۔ اُوپر خوب خوشبو کا چھڑکاؤ کیا۔ جگّو میاں کو کندھے پر بٹھایا اور مشاعرے کے لیے روانہ ہوئے۔

3۔ پنڈال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے اور خوب داد وصول کر رہے تھے۔ چچا خواہ مخواہ لوگوں میں جگہ بناتے ہوئے سب سے اگلی رو میں بیٹھ گئے۔

''ارے بھئی! یہ بھی کوئی شاعری ہے؟ اس سے اچھی تو میاں ہم کر سکتے ہیں۔'' چچا خواہ مخواہ زور سے چلائے۔ سٹیج پر بیٹھے شاعر تک بھی اُن کی آواز پہنچی۔

''تو یہاں کیا کر رہے ہیں اُوپر آئیں اور اپنا کلام سنائیں'' شاعر صاحب غصے میں بول کر سٹیج سے اُتر گئے۔

4۔ چچا خواہ مخواہ سٹیج پر پہنچے اور کلام پڑھنا شروع کیا۔

آپ لگتا ہے کہ منہ دھوتے نہیں
رات بھر جاگتے ہیں سوتے نہیں

کھاتے ہیں آپ انڈے بہت
پڑتے ہیں بیگم سے ڈنڈے بہت

گھر میں ہمارے ہیں دو مور
لگتے ہیں آپ پکے چور

''ارے! کچھ بھی بول رہا ہے خواہ مخواہ'' مجمع سے کوئی چلایا۔

''چچا بھاگو!'' جگنو میاں چلایا۔ اور سارا مجمع چچا خواہ مخواہ پر ٹوٹ پڑا۔۔۔۔۔۔

ہاہ ہاہ ہاہ۔۔۔۔۔۔

اُسے مزید محفوظ رکھنے کے لیے ایک صندوق میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔ وہ دونوں رات کو بمشکل دو گھنٹے سوئے۔ باقی وقت اس خوفناک اور پراسرار ہاتھ سے متعلق گفتگو میں گزرا۔

صبح ہوئی تو انھوں نے سیر کا پروگرام بنایا۔ محمود صاحب نے صندوق میں پراسرار ہاتھ کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے تالا کھولا تو وہ اس میں موجود تھا۔ تالا دوبارہ لگا دیا گیا۔ محمود صاحب جو پولیس انسپکٹر تھے اور سلیم کے دوست بھی تھے ان کے سر پر خوفناک ہاتھ بھوت کی طرح سوار ہو چکا تھا اس لیے سلیم نے سوچا کہ محض سیر ان کے ذہن سے خوفناک ہاتھ کا خیال نہیں نکال سکے گی۔ چنانچہ وہ انھیں ساتھ لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ دوسرے دن انھیں ایک خط موصول ہُوا۔

''میں آپ کی پرانی خادمہ ہوں۔ اب میں اتنی بوڑھی ہوگئی ہوں کہ کام نہیں کر سکتی اس لیے میں اپنے بال بچوں کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ فقط مہتاب بی بی۔'' یہ خط پڑھ کر پولیس انسپکٹر محمود صاحب نے سوچا مہتاب بی بی نے اپنی تنخواہ میں اضافے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سلیم سے مشورہ کر کے ان کے نام خط لکھا کہ ہم تمھاری تنخواہ میں دو سو روپے ماہوار کا اضافہ کرتے ہیں۔ دو دن بعد انھیں مہتاب بی بی کا جواب ملا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ایک جرم کیا ہے اور اب اس کا اقرار کر رہی ہوں۔ میں نے صندوق میں چوہے کو غذا کی ضرورت ہے اس لیے میں نے تالا توڑ دیا لیکن جب میں نے چوہے کو اُسے ڈبے سے نکال کر پنجرے میں بند کرنا چاہا تو وہ بھاگ گیا۔ چوں کہ یہ سب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہُوا ہے اس لیے اُمید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔''

محمود صاحب اور سلیم حیران تھے کہ انھوں نے مہتاب بی بی کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا، ملازمہ کے خط نے انھیں بے چین کر دیا۔ اس لیے انھوں نے صحیح صورتحال سے آگاہ ہونے کی خاطر فوراً واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں پہنچے تو ان کے پوچھنے پر ملازمہ مہتاب بی بی نے کہا۔

''جس دن آپ دونوں یہاں سے گئے۔ اس دن میں نے فرش پر ایک خط پڑا ہُوا پایا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سلیم بابو نے لکھا ہے لیکن خط روشنائی کے بجائے پنسل سے لکھا گیا تھا اس میں تحریر تھا۔'' ہوڑا یا کوئی اور چیز لو۔ لائبریری میں صندوق کا تالا توڑ ڈالو۔ اس

آخری قسط

پُر اسرار ہاتھ

امان اللہ نیر شوکت

کے اندر ایک ڈبہ ہے۔ بس تمہیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ڈبے کا ڈھکنا پہلے ہی کھلا ہوا ہے۔ فقط سلیم۔"

"اور پھر تم نے صندوق کا تالا توڑ دیا؟" محمود صاحب نے غصّے سے تڑپ کر سوال کیا۔

"جی ہاں صاحب جی! اور جب میں پنجرہ کو ڈبے کے قریب کر رہی تھی تو چوہا پلک جھپکتے ہی بھاگ گیا۔"

"کون سا چوہا؟"

"وہی جو ڈبے میں بند تھا۔"

"وہ کس قسم کا تھا؟"

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ اپنے نوکدار پنجوں پر چل رہا تھا۔ میں اُسے دیکھنے کے لیے مڑی تو وہ آدھے سے زیادہ باہر جا چکا تھا۔"

بوڑھی ملازمہ مہتاب بی بی نے قدرے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

"اس کی رنگت کیسی تھی؟" محمود صاحب نے سوال کیا۔

"صاحب جی! میرا خیال ہے اس کی دُم نہیں تھی۔ وہ بڑے خوفناک انداز میں رینگ رہا تھا۔" ملازمہ نے خوفزدہ ہو کر جواب دیا۔

"پھر ایسے میں تم نے فوراً کیا کام کیا؟"

میں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر میں نے لائبریری کا دروازہ بند کر دیا۔ ہاں ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ تمام ملازمائیں آج کل ایک کٹے ہوئے ہاتھ کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا ہیں۔" ملازمہ سکینہ کی اس سے اچانک ملاقات سیڑھیوں میں ہوئی تھی۔ وہ برتن صاف کر رہی تھی کام سے فارغ ہو کر وہ تولیے سے ہاتھ پونچھنے لگی تو اس نے دیکھا کہ ایک سرد خوفناک ہاتھ اس کے اندر چھپا ہوا تھا۔

"یہ کیا بکواس ہے مہتاب بی بی؟" سلیم بگڑ گیا۔ عین اُسی وقت باورچی بھی وہاں آ پہنچا۔ اس نے سلیم کو بتایا کہ:

"آج کل اکثر اوقات باہر کی گھنٹی بجتی ہے۔ جب ہم باہر جاتے ہیں تو کوئی نہیں ہوتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ مرحوم اختر صاحب کے کسی پالتو بندر کی شرارت ہے۔"

تمام ملازموں کو رخصت کر دیا گیا۔ سلیم اور محمود نے سوچا کہ خط کس نے لکھا تھا۔ سلیم نے خط کو ہاتھ میں پکڑا اور اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کچھ لمحات گزرنے کے بعد کہا:

"جس کاغذ پر یہ تحریر لکھی گئی ہے اُسے میں نے تقریباً دو سال سے استعمال کرنا ترک کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کاغذ کے کچھ ٹکڑے صندوق میں پڑے رہ گئے ہوں گے۔ تمہیں یاد ہے محمود کہ ہم نے خوفناک ہاتھ کو دیکھنے کے بعد ڈبے کا ڈھکنا بند نہیں کیا تھا۔ اسی لیے وہ باہر نکل آیا۔ خوش قسمتی سے صندوق میں اُسے پنسل بھی مل گئی۔ اس نے تحریر لکھ کر صندوق کی راستے کاغذ باہر پھینک دیا۔ مہتاب بی بی نے اُسے اُٹھا لیا اور اس کے مطابق عمل کیا۔"

"لیکن کٹا ہوا ہاتھ کیسے لکھ سکتا ہے؟" محمود صاحب نے خوفزدہ ہو کر سوال کیا۔

"میں نے اُسے وہ کرتب کرتے دیکھا ہے محمود جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ بہرکیف اُسے پکڑنے کی سرتوڑ کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ وہ ہمارے لیے بہت خطرناک ہے۔" سلیم نے پریشان ہوتے ہوئے جواب دیا۔

اس واقعہ کے تین دن بعد سلیم رات کے وقت لائبریری میں اکیلا بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک کھلی ہوئی کتاب پر پڑی جس کے اوپر وہی خوفناک ہاتھ اس طرح پڑا تھا جیسے وہ پڑھ رہا ہو لیکن اس سے پہلے کہ سلیم کرسی سے اُٹھتا خوفناک ہاتھ نے کتاب سے چھلانگ لگائی اور دروازے کے ساتھ لٹکے ہوئے پردے پر چڑھ گیا۔ سلیم نے سوچا کہ کیوں نہ کتوں کی مدد سے اُسے پکڑا جائے لیکن تقریباً ایک ہفتہ بعد ملازمہ سکینہ کے طوطے نے اُسے پکڑوا دیا۔ ایک دن سکینہ کو نہ جانے کیا خیال آیا اپنے پالتو طوطے کو بغیر پنجرہ کے لائبریری میں چھوڑ گئی جہاں سلیم بیٹھا تھا۔ وہاں وہ اپنی باتوں سے سلیم کا دل بہلا رہا تھا۔ اچانک اس کی آواز رُک گئی اور وہ پھڑ پھڑانے لگا۔ پانچ انگلیوں کی مضبوط گرفت نے طوطے کو گردن سے دبا رکھا تھا۔ وہ کمرے میں اس وزن سمیت چکر لگا رہا تھا۔ طوطا بے چارہ پھڑک رہا تھا۔ آخر نڈھال ہو کر وہ گر گیا۔ اس سے پہلے کہ خوفناک ہاتھ فرار ہو جاتا سلیم نے اُسے قابو کر لیا۔ اس نے فوراً گھنٹی بجائی ملازم حاضر ہوا۔ وہ سلیم کے حکم پر محمود صاحب کو بلا لایا۔ سلیم چاہتا تھا کہ اُسے آگ میں جھونک دے مگر اُسے حوصلہ نہ ہوا۔ محمود صاحب تھوڑی دیر بعد لکڑی کا ایک ٹکڑا، ہتھوڑی اور کیل لے کر آ گئے۔ "پہلے اس میں کیل گاڑ دو محمود پھر اس کا تجزیہ کریں گے۔ آج یہ ہماری گرفت سے بچ کر نہ جانے پائے۔" سلیم نے کہا۔

جب خوفناک ہاتھ میں کیل گاڑی جا رہی تھی تو اس نے خود کو چھڑانے کے لیے بڑی جدوجہد کی اور جب اس میں کیل گاڑ دی گئی تو وہ بڑی بے تابی سے گھومنے لگا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر سلیم نے منہ دوسری طرف کر لیا اور محمود صاحب سے کہا:

"اس کو کپڑے سے ڈھانپ دیں۔ انہوں نے کرسی کا ایک غلاف اُتارا اور خوفناک ہاتھ کو اس سے ڈھانپ دیا۔" سلیم نے صندوق کھولا اور محمود صاحب نے بڑی بے دردی سے خوفناک ہاتھ کو اس میں پھینک دیا۔ سلیم نے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا:

"میں نہیں چاہتا کہ اس حالت میں دوبارہ خوفناک کٹے ہوئے ہاتھ کی بھیانک شکل دیکھوں۔ مجھے تو اس کی غیر معمولی حرکتوں سے وحشت ہونے لگی ہے۔"

مہتاب بی بی مہینہ کے آخر میں رخصت لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد سلیم نے شادی کر لی لیکن شادی کے چند روز بعد اس کے گھر میں چوری ہو گئی دوسری چیزوں کے علاوہ چور آہنی سیف بھی توڑنے میں کامیاب ہو گئے لیکن خوش قسمتی سے اس میں کچھ نہ تھا۔ پولیس انسپکٹر محمود صاحب نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ سوچا اور پھر سلیم کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا:

''جس طریقے سے یہ واردات ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چور بڑا تجربہ کار ہے۔ خاص طور پر اس نے آہنی سیف کھولنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ چور نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے اور میں نے مکان میں ہر جگہ اس کی انگلیوں کے واضح نشان دیکھے ہیں جس سے ہماری تشویش بڑھ سکتی ہے۔''

''کس ہاتھ کے نشان؟'' سلیم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''صرف دائیں ہاتھ کے نشانات یہ بھی بڑی حیرت کی بات ہے اور یہ تحریر شاید اسی خوفناک ہاتھ نے لکھی ہے۔'' پولیس انسپکٹر محمود صاحب نے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس میں لکھا تھا:

''سلیم میں بھاگنے میں کامیاب ہوگیا ہوں لیکن میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ محمود صاحب بے درد پولیس انسپکٹر ہے۔ اس نے بڑی بے دردی کے ساتھ مجھے صندوق میں پھینکا تھا۔ اس سے کہنا کہ وہ مجھ سے ہوشیار ہوکر رہے۔ فقط: خوفناک ہاتھ۔''

سلیم نے رقعہ پڑھ کر محمود صاحب سے کہا:

''وہ اب آپ کو وارننگ دے گیا ہے۔ فی الحال میں یہاں مزید رک نہیں سکتا۔ میرا تو دماغ پاگل ہوگیا ہے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ تمھیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ تم نے خوفناک ہاتھ میں کیل ٹھونک کر اپنے سر ایک نئی مصیبت مول لے لی ہے۔'' محمود پولیس انسپکٹر ہوتے ہوئے بھی خوفناک ہاتھ کی تحریر سے خوفزدہ ہوگیا۔ اس نے اسی وقت سامان باندھا اور وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ گھر پہنچ کر سلیم نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ غسل خانے میں گیا لیکن ایک چیخ مار کر بے ہوش ہوگیا۔ محمود صاحب بھاگتے ہوئے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سلیم فرش پر چت پڑا ہوا ہے اور فلش کا زنجیر کے ساتھ وہی پراسرار خوفناک کٹا ہوا ہاتھ لٹک رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ محمود صاحب سلیم کی طرف متوجہ ہوتے۔ خوفناک ہاتھ نے فلش کی زنجیر سے چھلانگ لگائی اور محمود صاحب کا چہرہ اپنے نوکدار پنجے سے نوچتا ہوا زمین پر گرا اور پلک جھپکتے ہی کہیں چھپ گیا۔ خوفناک ہاتھ نے ان کے چہرے کی کھال نوچ لی تھی اور خون رس رہا تھا۔ وہ فوراً قریبی کلینک کی طرف دوڑا۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی۔ خون صاف کیا۔ محمود صاحب کا خوبصورت چہرہ بدنما اور بدصورت سا ہوگیا تھا۔ رخسار پر کئی ٹانکے لگے۔ خوف کی وجہ سے ان کی بہت بڑی حالت تھی لیکن وہ دل کے مضبوط تھے۔ وہ فوری طور پر واپس گھر پہنچے۔ سلیم کو ٹو کر نے بستر پر لٹا دیا تھا اور ڈاکٹر کو فون کر کے بلوایا۔ انہوں نے آکر تشخیص دیکھی تو کہا:

''سلیم کو ذہنی طور پر صدمہ ہوا ہے۔ انھیں ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے رات کے وقت بھی بجلی جلتی رہنی چاہیے۔

دوائی لیتے رہنے سے سلیم کی طبیعت سنبھل گئی۔ جب اس نے محمود صاحب کی طرف دیکھا تو ان کا زخموں سے بھرا بدنما چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ اسی کٹے ہوئے خوفناک ہاتھ کے حملے کا شکار ہوئے ہیں۔ خوفناک ہاتھ نے واقعی پولیس انسپکٹر محمود صاحب سے اپنا بدلہ لیا تھا۔ سلیم کے لیے اس کا اپنا مکان بھی خطرناک تھا۔ پولیس انسپکٹر محمود صاحب چوں کہ سلیم کے دوست تھے اس لیے وہ ڈیوٹی سے فارغ ہوکر اکثر سلیم کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنا مکان چھوڑ کر کرائے پر ایک مکان لیا اور اس میں رہنے لگے۔ دو دن بعد انہیں ایک خط موصول ہوا۔ دھڑکتے دل سے انہوں نے خط کھولا۔ اس میں لکھا تھا۔

''کیا پیر کے روز بارہ بجے کا وقت ہماری آخری ملاقات کے لیے موزوں نہیں رہے گا؟ محمود صاحب کس حال میں ہیں۔ نہ وہ اتنی بے رحمی سے مجھ میں کیل گاڑتے اور نہ میں اتنی بے دردی سے ان کا چہرہ نوچتا۔ تم بھی پولیس انسپکٹر کے ساتھی ہو اس لیے تمہاری حالت پر بھی مجھے بہت افسوس ہے آخر میں نے تم دونوں کا کیا بگاڑا ہے۔ فقط خوفناک ہاتھ۔'' دونوں اب اس نئی مصیبت کا انتظار کرنے لگے۔ جب دوپہر کے بارہ بجے تو عین اسی وقت دروازہ پر دستک ہوئی۔ پوچھنے پر کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سلیم فوراً اٹھا اور تمام دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کو مضبوطی سے بند کر دیا دروازوں کو تالے بھی لگا دیے گئے۔ آتش دان میں آگ روشن کرنے کے لیے لکڑیاں رکھیں لیکن آگ نہ لگی۔ محمود صاحب بھاگے ہوئے گئے تاکہ لیمپ لے آئیں اور اس میں سے کیروسین آئل نکال کر لکڑیوں پر پھینک دیں۔ اس افراتفری میں کچھ تیل ان کے کپڑوں پر گرا، کچھ بستر پر، کچھ کرسیوں پر، کچھ فرش پر اور باقی بچا کھچا تیل لکڑیوں پر انڈیل دیا۔ آگ روشن کی گئی لیکن بدقسمتی سے آگ کے شعلے محمود صاحب کے کپڑوں تک پہنچ گئے وہ گھبرا گئے۔ انھیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کریں۔ سلیم نے انھیں کمبل اوڑھنے کے لیے کہا لیکن کمبل کہیں نہ ملا۔ تمام دروازے بند تھے بالآخر انہوں نے ہمت کر کے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ محمود صاحب کی حالت غیر ہورہی تھی۔ انہوں نے دروازہ کھول کر باہر جانے سے پہلے ایک نظر سلیم پر ڈالی تو خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ خوفناک کٹا ہوا ہاتھ آگ میں سے زندہ سلامت نکل کر سلیم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ محمود صاحب چاہتے تھے کہ وہ سلیم کی طرف بڑھیں لیکن کمرے میں اس قدر دھواں پھیل چکا تھا کہ وہ آگ آگ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے اور پھر باہر جاکر گیلی گھاس پر لیٹ گئے۔ اچانک ایک خوفناک چیخ نے انہیں ایک طرف متوجہ کر لیا اور پھر دھڑام سے کسی بھاری چیز کو نیچے گرتے سنا۔ سلیم نیچے گرا تھا اور زخمی ہوگیا تھا۔ لیکن آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ خوفناک کٹا ہوا پراسرار ہاتھ کس قسم کی طاقت رکھتا تھا اور وہ صرف سلیم کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑا تھا اور وہ پراسرار ہاتھ اپنی پراسراریت کے ساتھ آخر کہاں غائب ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

چڑیا

حمیرا نوشین

چوں چوں کرتی چڑیا آئی
سب کے دل کو چڑیا بھائی

دلکش سی آواز ہے اس کی
بڑی تیز پرواز ہے اس کی

گھونسلہ بنا کر انڈے دے
پھر دن رات یہ پہرا دے

بچوں کو جب یہ دانہ چگائے
تب کوئی نہ اس کے قریب آئے

چھوٹے چھوٹے بچے اس کے
پیارے پیارے بچے اس کے

سیڑھی لگا کر گڈو پہنچا
چڑیا نے فوراً مارا ٹھونگا

گڈو کی تو سیڑھی پھسلی
ٹوٹتے ٹوٹتے بچ گئی پسلی

امی نے خوب گڈو کو جھڑکا
کیوں چھیڑا گھونسلہ اس کا

گڈو نے پھر توبہ کی
چڑیا اس کو گھور رہی تھی

بچوں کو نہ چھیڑے گا وہ
گھونسلے کو نہ توڑے گا وہ

بچو! یاد رکھو یہ بات
گھر پرندوں کا رکھو آباد

آئے تن کی تتلی

قسط:1

حنیف ملک

پہاڑوں پر بہت خوبصورت اور ٹھنڈی شام اتری تھی۔ ننھی آئے تن نے ایک ہاتھ میں درخت کی چھال سے بنی ٹوکری پکڑ رکھی تھی جبکہ دوسرے سے دادو کی انگلی تھام رکھی تھی۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر جھومتی دادو سے دو قدم آگے چل رہی تھی آج وہ بہت خوش تھی کیونکہ آج وہ اپنے پسندیدہ مشغلے کے لیے جا رہی تھی۔ آج وہ پھر سے باغ میں جا رہے تھے اور آئے تن نے آتے وقت ساتھ ایک ٹوکری بھی پکڑلی تھی کیونکہ اس نے باغ سے خوبصورت پھول اکٹھے کرنے تھے۔ وہاں پہنچ کر دادو تو ایک بینچ پر بیٹھ گئیں جبکہ آئے تن پرجوش انداز میں باغ کی طرف چلی گئی۔ وہاں کھلے پھول اور ان کی مہک محسوس کرتے ہوئے وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ اس نے خوبصورت رنگوں کے پھول توڑ کر ٹوکری میں اکٹھے کرنے شروع کر دیے۔

آئے تن بے دھیانی سے پھول توڑنے میں مگن تھی۔ جب اس نے گلاب کے سرخ پھول کو توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس پر بیٹھی تتلی فوراً پھول سے اُڑ گئی۔ آئے تن نے دیکھا کہ وہ زرد رنگ کی ایک بہت ہی خوبصورت پروں والی تتلی تھی جس کے رنگ برنگے پروں پر مختلف رنگوں کی خوبصورت دھاریاں بنی تھی۔ آئے تن پھول کی ٹوکری زمین پر رکھ کر تتلی کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ تتلی آگے آگے اڑ رہی تھی جبکہ آئے تن اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ تتلی سفید گلاب کے ایک ادھ کھلے پھول پر بیٹھ گئی۔ آئے تن نے آہستہ آہستہ اس کو پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور حیرت کی بات ہے کہ تتلی نے کوئی مزاحمت نہیں کی آئے تن نے باآسانی اسے پکڑ لیا اور واپس اپنی ٹوکری کی طرف بڑھ گئی۔

”آئے! بیٹا آ جاؤ جلدی سے، واپس بھی جانا ہے، دیکھو مغرب ہونے والی ہے۔“

اسے دادو کی آواز سنائی دی وہ شاید اسی طرف آ رہی تھی۔ آئے نے فوراً تتلی کو ٹوکری میں رکھ کر ڈھکن بند کر دیا اور دادو کے ساتھ گھر کی طرف چل دی۔

گھر آتے ہی آئے تن سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اسٹور روم سے ایک پلاسٹک کا ڈبہ ڈھونڈ کر لے آئی اسے اچھی طرح سے صاف کرنے کے بعد آئے تن نے اس کے نیچے پھول بچھائے اور ڈبے میں جگہ جگہ ہوا کے لیے سوراخ کیے۔ اس نے بڑی

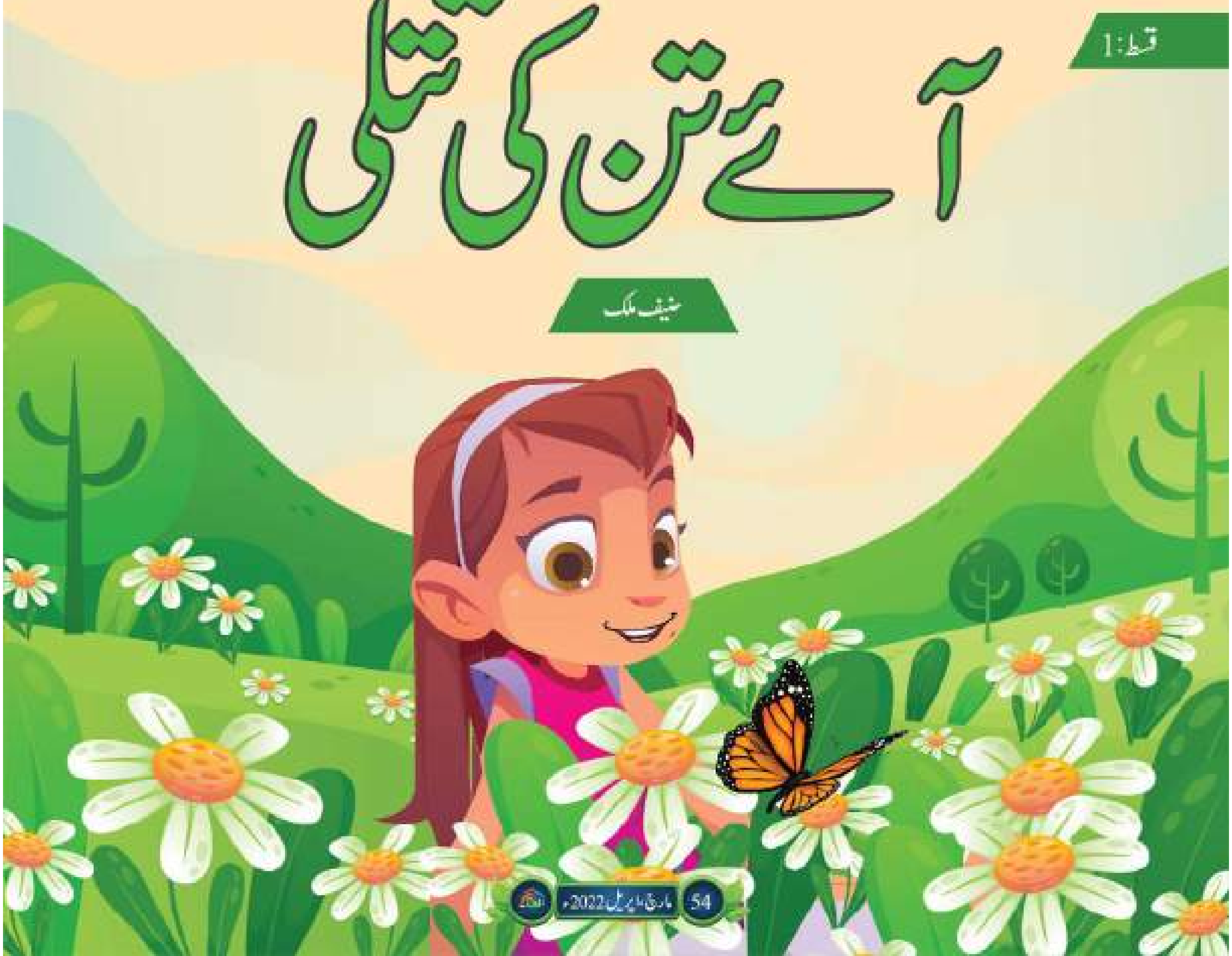

احتیاط سے ٹوکری کا ڈھکن ہٹایا تتلی سامنے ہی پھولوں پر بیٹھی تھی۔ آئے نے تتلی کو اٹھایا اور ڈبے میں ڈال دیا۔ ڈبے کو اسٹڈی ٹیبل پر رکھ کر وہ خود بھی کرسی کھینچتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے آئے بڑی محویت سے تتلی کو دیکھ رہی تھی جب اسے کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے فوراً ڈبے کو ٹیبل کے اندر رکھا اور خود سامنے پڑی کتاب کھول لی۔

''آئے! ابھی تک سوئی نہیں ہو؟''

ماما نے دروازے سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جی ماما! میں بس سونے لگی تھی۔''

وہ اٹھ کر اپنا بستر درست کرنے لگی جب ماما چلی گئیں تو اس نے ایک دفعہ پھر ڈبے کو باہر نکال کر دیکھا اور واپس رکھ کر بستر پر آ گئی آج تو اسے خوشی کے مارے نیند ہی نہیں آ ئی تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے ذہن میں فوراً تتلی کا خیال آیا۔ وہ بھاگ کر بستر سے اتری اور ٹیبل کے نیچے سے ڈبہ نکالا لیکن یہ کیا...... ڈبہ تو خالی تھا آئے تن نے ڈبے کو ادھر ادھر سے چیک کیا لیکن وہ ہر طرف سے بند تھا۔

''تتلی کہاں گئی؟''

اس کا دل یکدم اداس ہو گیا تھا۔ ایک ننھا سا آنسو اس کی آنکھ سے بہہ نکلا۔ اسکول میں بھی سارا دن وہ اداس رہی۔ گھر واپس آ کر بھی اس نے کسی سے بات نہ کی اور اداس سے بیٹھی رہی۔ سب کے پوچھنے کے باوجود بھی جب آئے نے کچھ نہ بتایا تو دادو اس کا موڈ اچھا کرنے کے لیے اسے باغ لے گئیں لیکن اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ آج وہ اپنے ساتھ ٹوکری بھی نہیں لائی تھی۔ وہ باغ میں آئی تو اسے گلاب کے اسی سفید ادھ کھلے پھول پر زرد رنگ کی کوئی چیز محسوس ہوئی اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ یہ تو وہی خوبصورت تتلی تھی جسے کل اس نے پکڑا تھا۔ آئے کا چہرہ ایکدم خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ دوبارہ سے اس تتلی کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھی لیکن اس کا ہاتھ لگتے ہی تتلی غائب ہو گئی۔ آئے ایک جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔ اسے اپنے سامنے بہت سے ستارے اڑتے محسوس ہوئے جنہوں نے اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوبصورت پری کا روپ دھار لیا۔ زرد رنگ کی پری اور اس کے پر...... آئے نے دیکھا کہ اس کے پر بالکل اس تتلی جیسے تھے، رنگ برنگے اور خوبصورت......

''شکریہ، پیاری آئے! تم نے مجھے برسوں کی قید سے آزاد کروایا۔'' پری مسکراتے ہوئے آئے کے آگے جھک گئی۔

''کک......کون ہو تم؟''

''میں پری زرنگاہ ہوں، آئے! پرستان کی ایک شہزادی۔ مجھے ایک ظالم دیو نے قید کر لیا تھا۔ اس کا مقصد مجھ سے پرستان کو حاصل کرنا تھا اور پھر اس پر حکومت کرنا تھا لیکن میں اپنے دیس کی پیاری اور معصوم پریوں کو کسی ظالم کے حوالے نہیں کر سکتی تھی۔ میرے انکار کرنے پر اس دیو نے مجھے یہ سزا دے دی۔''

زرنگاہ پری اداس لگ رہی تھی آئے تن اب خوف زدہ ہونے کی بجائے پری کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

''کیسی سزا؟'' آئے نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا

''اس نے مجھے تتلی بنا کر اس دنیا میں بھیج دیا اور ٹھیک ہونے کے لیے ایک شرط رکھی کہ جب تک مجھے کوئی اچھا اور معصوم شخص نہیں چھوئے گا، میں تب تک واپس اپنے اصلی روپ میں نہیں آ سکتی اور تمہیں پتہ ہے آئے، میں پچھلے پانچ سال سے یہاں بھٹک رہی ہوں اور کل جب تم نے مجھے چھوا اور میں واپس اپنے اصلی روپ میں آئی تو مجھے یہ دیکھ کر کافی حیرت ہوئی کہ تم تو ایک سات سالہ بچی ہو۔''

آئے تن بڑے غور سے سنہری بالوں والی اس خوبصورت پری کو سن رہی تھی۔

''اب تم نے مجھے آزاد کروایا ہے تو واپس پرستان جانے سے پہلے میں تمہاری کوئی بھی ایک خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں، آئے!''

پری آئے کی طرف جھکتے ہوئے پیار سے بولی اور ننھی آئے سوچ میں پڑ گئی۔ آخر بہت سوچنے کے بعد وہ بولی:

''میں پرستان جانا چاہتی ہوں۔''

آئے جب بھی دادو سے پریوں کی کہانی سنا کرتی تھی، وہ سوچتی کہ وہ بڑی ہو کر پرستان کی کھوج کو نکل جائے گی اور وہاں کی خوبصورت، بہادر اور نیک دل پریوں سے ضرور ملے گی۔

اب سوچنے کی باری پری کی تھی۔

''ضرور آئے! لیکن پرستان میں داخل ہونے کے لیے تمہیں کچھ امتحانوں سے گزرنا پڑے گا۔ اگر تم نے وہ امتحان پاس کر لیے تو تم میری ساتھ وہاں کی سیر کو ضرور جا سکو گی۔ تو بتاؤ پیاری آئے! کیا تم ان امتحانوں کے لیے تیار ہو؟''

''میں تیار ہوں، پری زری!''

آئے نہایت جوش سے بولی۔ پری نے مسکراتے ہوئے اپنی سنہری چھڑی گھمائی تو آئے تن کے پاؤں کے نیچے ایک اڑن قالین آ گیا۔

''چلو، اپنا سفر شروع کرتے ہیں آئے!''

قالین ہوا میں اڑنے لگا۔ آئے پرجوش انداز میں نیچے گزرتی دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ ان کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اب دیکھتے ہیں کہ کیا آئے پرستان میں داخل ہونے کی اہل بن سکتی ہے؟ کیا آئے اپنے سامنے آنے والے مشکل حالات کا سامنا کر سکے گی؟

(باقی آئندہ)

پراسرار کتاب

مصباح ناز

فریال اور اسکا بھائی عمر اسکول سے واپس آ رہے تھے کہ انہیں راستے میں عجیب حلیے میں ایک شخص نظر آیا۔ اس کے کپڑے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے، مانو وہ کیچڑ میں ڈبکی لگا کر آیا ہو اور اسکے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے بھی تھے۔ وہ شخص کچھ پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سنہرے رنگ کی کتاب موجود تھی۔ کتاب خوب چمک رہی تھی اسی لیے فریال اور عمر کی توجہ فوراً کتاب کی طرف ہو گئی۔ وہ شخص کتاب کو کچرے کے ڈھیر میں دبا رہا تھا۔ یہ شخص اتنی خوبصورت اور چمک دار کتاب آخر کچرے میں کیوں پھینک رہا ہو۔ فریال نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کتاب جلدی سے اس شخص کے ہاتھ سے اچک لے۔

اس کتاب کو وہاں دبانے کے بعد وہ شخص یہاں وہاں دیکھنے لگا۔ جیسے وہ یہ چیک کرنا چاہ رہا ہو کہ کہیں اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ فریال اور عمر کو یہ بات کچھ عجیب لگی۔ وہ اس شخص کے جانے کے بعد عین اس جگہ پہنچ گئے جہاں اس نے وہ کتاب کچرے کے نیچے دبائی تھی۔ فریال نے عمر کو نظر رکھنے کے لیے کہا اور خود جلدی سے وہ کتاب کچرے سے نکال کر اپنے اسکول کے بستے میں چھپالی۔

گھر آ کر ان دونوں نے کھانا کھایا۔ اسکے بعد وہ کچھ دیر سو گئے۔ شام میں جب وہ جاگے اور اسکول کا کام کرنے لگے تب ہی فریال کی دوبارہ نظر اپنے بستے میں موجود کتاب پر پڑی۔ مگر اس وقت امی آس پاس تھی اور اگر امی کتاب دیکھ لیتیں تو ضرور پوچھتی کہ وہ کتاب کہاں سے اُن کے پاس آئی ہے۔ اس لیے وہ اسے کھول نہیں سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کو کتاب کا مطالعہ کریں گے۔

فریال اور عمر کیونکہ ابھی چھوٹے تھے اس لیے رات میں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ امی نے رات کو انہیں اسکے کمرے میں لٹایا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ دونوں امی کے جانے تک اپنے اپنے بستروں میں یوں لیٹے رہے جیسے سو رہے ہوں۔ جیسے ہی امی گئی وہ دونوں فوراً کتاب کھول کر بیٹھ گئے۔ فریال کیونکہ عمر سے بڑی تھی

اور پانچویں جماعت میں تھی اس لیے کتاب اس نے پڑھنی شروع کی۔ عمر ویسے بھی ابھی تیسری جماعت میں تھا اس لیے اُس کی اردو ابھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ کتاب میں مختلف منتر مختلف کاموں کے لیے لکھے گئے تھے۔ آدھے تو انہیں سمجھ بھی نہ آئے۔ وہ دونوں خوش ہو گئے کہ انہیں ایک جادوئی کتاب مل گئی ہے۔ مگر اس کتاب میں کوئی جادو ایسا نہ تھا جس سے کھانے پینے کی مزے مزے کی چیزیں آجاتی یا ان کی پسند کے کھلونے کپڑے آجاتے۔ یہ کچھ اور ہی طرح کے جادو تھے۔ خیر انہوں نے کتاب کو کمرے میں اپنے کھلونوں کے درمیان یوں چھپایا کہ کسی کی نظر وہاں نہ جاسکے اور اسے استعمال کرنے کے لیے صحیح وقت کا انتظار کرنے لگے۔

چند دن بعد عمر اور فریال اسکول سے گھر آئے تو امّی نے انہیں خبر دی کہ وہ ان کے چچا کے گھر جارہے ہیں۔ انہیں اپنے چچا کے گھر جانا بالکل پسند نہ تھا کیونکہ وہ ایک بہت چھوٹے علاقے میں تھا۔ وہ علاقہ بالکل گاؤں کا منظر پیش کرتا تھا۔ اگلے دن اتوار تھا اس لیے انہیں آج کی رات وہاں ہی رہنا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر تو ان کو اور بھی غصہ آرہا تھا۔ امّی نے انہیں سختی سے کہا تو وہ چچا کے گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ فریال کو اچانک جادوئی کتاب کا خیال آیا تو اس نے اسے بھی اپنے بستے میں ڈال لیا۔

شام تک وہ چچا کے گھر پہنچ چکے تھے۔ ان کے چچا کے تین بیٹے محمود، عرفان، جہانزیب تھے۔ وہ تینوں ہی فریال اور عمر سے بڑے تھے۔ اس لیے ان سب کی آپس میں کوئی خاص دوستی بھی نہ تھی۔ بلکہ وہ انہیں ہمیشہ ستاتے رہتے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کے وہاں پہنچنے کی دیر تھی کہ محمود، عرفان اور جہانزیب نے عمر اور فریال کی ٹانگ کھینچنا شروع کردی۔ جس سے وہ خوب چڑنے لگے۔ عمر فوراً شکایت لگانے امّی کے پاس پہنچ گیا۔ مگر امّی نے یہ کہہ کر اسے بھیج دیا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔ اس پر اب وہ عمر کا اور بھی مذاق اڑانے لگے کہ وہ شکایتی ٹٹو بھی ہے۔ عمر روتے ہوئے وہاں سے باہر نکل آیا اور صحن میں جا بیٹھا۔ اس کے پیچھے پیچھے فریال بھی بھاگتی باہر آگئی۔ فریال اسے چپ کروا رہی تھی مگر وہ اسکی بات بھی نہیں سن رہا تھا۔ تب ہی فریال کو جادوئی کتاب کا خیال آیا۔ وہ فوراً بستے سے کتاب نکال لائی۔

آؤ عمر ہم دونوں اس کتاب سے کوئی منتر تلاش کرکے آزماتے ہیں اور ان سب کو سبق سکھاتے ہیں۔

فریال نے غصیلے لہجے میں کہا۔ اُس کے اندر انتقام کی آگ جل رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی عمر سے بہت پیار کرتی تھی۔ فریال نے کتاب میں سے جلدی ایک منتر ڈھونڈ لیا۔ اس منتر کے مطابق انہیں پہلے مٹی چاہیے تھی۔ جو انہیں با آسانی وہاں مل گئی۔ کیونکہ گھر کے صحن کا کچھ حصہ کچا تھا وہاں کافی زیادہ پودے لگے تھے۔ اب انہیں اس مٹی سے ایک چھوٹا سا پتلا تیار کرنا تھا۔ اُس کے بعد اس پتلے کے ماتھے پر ایک نشان بنا کر اس منتر کو پڑھنے کے بعد اس پر پھونک مار کر اس پتلے کو حکم دینا تھا جس سے بھی انتقام لینا ہو لے لو۔

انہوں نے صحن سے مٹی اکٹھی کی اور ایک پتلا تیار کرلیا اور اسکے بعد جیسا لکھا تھا ویسا ہی نشان اسکے ماتھے پر بنا کر منتر پڑھ کر اس پر پھونکا اور فریال نے حکم دیا۔ جو بھی ان کو ستائے اسے سزا دو۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ دونوں مایوس ہوگئے کہ یہ کتاب نقلی ہے۔ وہ پتلے کو وہیں چھوڑ کر اندر آگئے۔ فریال نے کتاب واپس اپنے بستے میں چھپادی۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر رات کا کھانا کھانے کے لیے میز پر آبیٹھے۔ کھانے کی میز پر بھی محمود، عرفان اور جہانزیب انہیں چڑاتے رہے مگر وہ دونوں کچھ نہ بولے۔

کھانا کھانے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں سونے پہنچ گئے۔ فریال اور عمر آج بھی ایک ہی کمرے میں تھے۔ ان کے چچا کا گھر ایک چھوٹے علاقے میں ضرور تھا مگر بہت وسیع گھر تھا۔ اس لیے ان کے لیے آرام سے الگ کمرہ میسر تھا۔ ابھی انہیں سوئے ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ انہیں کہیں سے شور کی آوازیں سنائی دی۔ وہ دونوں چونک کر اٹھ بیٹھے۔ یہ آوازیں کہیں بہت ہی قریب سے آرہی تھی۔ وہ دبے قدموں کمرے سے نکلے تو یہ آوازیں سامنے والے کمرے سے آتی محسوس ہوئی۔

یہ کمرا تو محمود لوگوں کا ہے۔ عمر نے ڈرتے ہوئے کہا۔

وہ باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ تب ہی ان کے شور سے باقی گھر والے بھی جاگ کر وہاں جمع ہوگئے۔ فریال کے ابو اور چچا نے مل کر دروازے کو توڑنے کی کوشش شروع کردی۔ سب کا پریشانی سے برا حال ہو رہا تھا۔ دروازہ ٹوٹتے ہی جو منظر سب نے دیکھا سب کے ہوش اڑ گئے۔ ایک مٹی سے بنا دیو جو کہ چھت تک لمبا تھا۔ محمود، عرفان اور جہانزیب کو اپنے ہاتھوں میں دبوچے کھڑا تھا۔ سب کی حالت غیر ہونے لگی۔ کسی نے ایسی بلا اپنی پوری زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ کسی کو اپنی آنکھوں دیکھے پر یقین نہ آرہا تھا۔ سب حیران کھڑے تھے۔ لیکن عمر اور فریال سب سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے ہی تو ایک مٹی کا پتلا بنا کر ان تینوں کو سزا دینے کا حکم دیا تھا۔ چچی کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔

وہ پتلا ان تینوں کو یہاں وہاں پٹک رہا تھا۔ چچا اور ابو گھر کے باہر جا کر مدد لانا چاہتے تھے مگر گھر کا دروازہ تو مانو کسی نے گوند سے جوڑ دیا ہو۔ دروازہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ اب ان تینوں کو چوٹیں بھی آگئی تھی۔ جہانزیب کے سر سے خون نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس کا سر ایک کیل سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

چچا نے جب اُس کی یہ حالت دیکھی تو وہ اس مٹی کے دیو پر خود حملہ کرنے لگے۔ مگر یہ بات اسے پسند نہ آئی اس نے اپنی ٹانگ چچا کو رسید کی اور وہ دور جا کر دروازے سے ٹکرا گئے۔ انہیں بھی گہری چوٹ آئی۔ عمر اور فریال کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اپنے کمرے میں بھاگے اور اس کتاب سے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ ڈھونڈنے لگے۔

بقیہ صفحہ نمبر: 05

رخشندہ بیگ

وطن تجھ پہ قربان

اے ارضِ وطن تجھ پہ قربان
ترے پالے ہوئے یہ شیر جوان

تیرے نام سے عزت پائیں گے ہم
ہر دم تجھ کو چاہیں گے ہم
چپہ چپہ تیرا سجائیں گے ہم
تیری عزت پہ سر کٹائیں گے ہم

سدا مہکتے رہیں گلوں سے دالان
اے ارضِ وطن تجھ پہ قربان
تیرے پالے ہوئے یہ شیر جوان

عالمِ اسلام کا ہو تو سدا آسمان
اے ارضِ وطن تجھ پہ قربان
تیرے پالے ہوئے یہ شیر جوان

تیری عظمتوں کے ہیں سارے نشان
اے ارضِ وطن تجھ پہ قربان
تیرے پالے ہوئے یہ شیر جوان

یہ غازی یہ غوری طاقت تیری
دشمنوں پہ بھاری صداقت تیری
ہے رب کی رضا بھی حفاظت تیری
بہت سوں پہ بھاری شجاعت تیری

وطن کا ہر جواں تیرا پاسبان
اے ارضِ وطن تجھ پہ قربان
تیرے پالے ہوئے یہ شیر جوان

قائم رہے گا وطن اللہ ہے نگہبان
اے ارضِ وطن تجھ پہ قربان
تیرے پالے ہوئے یہ شیر جوان

رمضان کا چاند

مریم ریحان

"دادی! چاند نظر آ گیا!" حمیرا بھاگتے ہوئے اپنی دادی کے پاس آئی جو مغرب کی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔

"دادی! دادی! رمضان کا چاند نظر آ گیا۔" حمیرا اب اپنی دادی کے برابر میں بیٹھ کر ان کا دوپٹہ کھینچنے لگی۔

"اچھا میری جان! آپ کو میری طرف سے رمضان کا چاند مبارک۔" یہ کہہ کر دادی نے اسے گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ اچھا آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے چاند کو دیکھ کر دعا مانگی؟"

"نہیں دادی، میں نے تو کوئی دعا نہیں مانگی" حمیرا نے دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلو کوئی بات نہیں، آئندہ اگر کبھی عید کا یا رمضان کا چاند دیکھو تو دعا مانگ لینا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ ساری دعائیں قبول کرتے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے دادی!" حمیرا دادی کے دوپٹے سے کھیلتے ہوئے بولی۔

"اچھا دادی! ہم رمضان میں روزے رکھنے کے علاوہ اور کیا کرتے ہیں؟"

"آؤ بیٹا! میں تمھیں بتاؤں کہ ہم رمضان میں کیا کرتے ہیں۔" دادی حمیرا کو اپنے پیڑ پر لے کر بیٹھ گئی۔

"رمضان میں ہمارا سب سے پہلا مقصد ہوتا ہے اللہ کی عبادت کرنا۔ ہم نے چاہے روزہ رکھا ہو یا نہیں، اللہ کی عبادت اس مہینے میں بہت افضل ہوتی ہے۔"

"لیکن دادی! یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیسے کرتے ہیں؟" حمیرا نے معصومیت سے پوچھا۔ "اللہ کی عبادت نماز پڑھ کر کرتے ہیں۔ قرآن پاک بھی پڑھتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے نا کہ مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز فرض ہے؟"

"جی دادی! مجھے پتہ ہے۔" حمیرا نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تو فرض نمازیں تو پڑھنی ہی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ قرآن پاک پڑھنے سے بھی بہت ثواب ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم رمضان میں تراویح بھی پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت دل لگا کر کرتے ہیں تاکہ وہ ہم سے خوش اور راضی ہو جائے اور کم از کم ایک بار تو قرآن پاک رمضان میں ختم کرنا چاہیے۔"

"تو دادی! ہم کیا رمضان میں صرف ایک ہی قرآن پاک پڑھتے ہیں؟" حمیرا نے پھر سے پوچھا۔

"نہیں نہیں! ہم جتنی بار بھی چاہیں رمضان میں قرآن پاک پڑھ سکتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں تو جتنا ہو سکے قرآن پاک پڑھنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے دادی! اور کیا کرتے ہیں؟" حمیرا نے کہا۔

بقیہ صفحہ نمبر 26

اُول جلول

رابعہ فاطمہ

اُول جلول دو بھائی تھے، لیکن کھوٹی قسمت دونوں ہی نرے احمق تھے۔ ان کی بیوقوفیاں پورے محلے میں مشہور تھی۔ ایک دن دونوں نے ٹھان لی کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ خود پر سے بے وقوفی کا داغ مٹا کر ہی رہیں گے۔

اُول نے جلول سے کہا:

"بس! بہت ہو گیا، ہم بھی سب لوگوں کو خوب محنت کر کے دکھائیں گے۔"

جلول جو کھانے کا بہت شوقین تھا اور اس وقت بھی سموسوں پر اپنا ہاتھ صاف کر رہا تھا، کہنے لگا:

"وہ کیسے اُول؟"

اُول نے جلول کو سموسوں کے ساتھ مصروف دیکھ کر غصے سے کہا:

"جلول پہلے تم سموسے تو کھا لو، ورنہ میری بتائی ہوئی ترکیب بے سود جائے گی۔"

جلول نے اس کے غصے کو بھانپتے ہوئے ڈر کے آدھا سموسہ پلیٹ میں ہی چھوڑ کر، پلیٹ ایک طرف کر دی اور کہا:

"اُول تم ترکیب بتاؤ، میں ہمہ تن خرگوش ہوں۔"

"اوہو! ہمہ تن گوش ہوتا ہے جلول۔" اُول نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ہاں! وہی، ہمہ تن گوش۔" جلول نے لفظ کو دہراتے ہوئے کہا۔

اُول نے اپنی بات کا آغاز کیا:

"دیکھو جلول! یہاں پاس ہی ایک حلوائی ہے۔"

"واہ حلوائی!" حلوائی کا نام سن کر جلول کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"تمہارے منہ سے ہر وقت رال ٹپکتی رہتی ہے۔ اب غور سے سنو۔" اُول نے چڑتے ہوئے کہا۔ اُول تھوڑے توقف کے بعد کہنے لگا:

"حلوائی کو ہوشیار اور قابل لڑکوں کی ضرورت ہے، جو اس کی دکان کو چار چاند لگا دیں۔"

"تو؟" جلول نے پوچھا۔

"تو ہم اس کے پاس نوکری کریں گے اور اپنی قابلیت سے اس کی دکان کو چار چاند لگا دیں گے۔" اُول اس وقت شیخ چلی کا بھائی معلوم ہو رہا تھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے اُول، پر یہ چار چاند آئیں گے کہاں سے؟ ہمارے پاس تو ایک بھی چاند نہیں۔" جلول نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ اس کے سر کے اوپر سے بات گزر گئی تھی۔

"اوہو جلول! تمہاری بے وقوفی کب ختم ہوگی؟ میرا مطلب ہے کہ ہم اپنی سمجھداری سے شام تک اس کا سارا مال گاہکوں کو فروخت کر دیا کریں گے اور اس طرح سب پر ہماری

قابلیت ظاہر ہو جائے گی۔" اُول نے تمام منصوبے سے جلول کو آگاہ کیا۔

"اوہ! اب سمجھا، لیکن ہم اس کا مال بیچیں گے ہی کیوں؟ ہم کھا بھی تو سکتے ہیں۔" جلول گھوم پھر کر اپنی مطلب کی بات پر واپس آ گیا تھا۔

"اوہ! وہ جلول! تمھیں کھانے کے علاوہ بھی کوئی کام سوجھتا ہے؟" اُول نے غصہ دکھایا۔

"ہاں! سونا مجھے خوب آتا ہے۔" جلول نے اُول کے غصّے کو نظر انداز کیا اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

☆......

اُول جلول حلوائی کی دکان کی جانب ہو لیے۔ دھوپ کی شدت کی وجہ سے اُول جلول کا برا حال ہو گیا تھا، اوپر سے سستی اور کاہلی نے ان کے انگ انگ میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ ہی دوری پر حلوائی کی دکان کو وہ خود سے میلوں دور محسوس کر رہے تھے۔ آخر وہ ہانپتے کانپتے حلوائی کے پاس پہنچ گئے۔

اُول نے بمشکل اپنے اکھڑے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"چچا میاں! ہم نے سنا ہے آپ کو اپنی دکان چلانے کے لیے دو لڑکوں کی ضرورت ہے جو عقل مند بھی ہوں اور چست بھی۔" "ہاں اُول! ضرورت تو ہے، پر اب تک کسی امیدوار نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔" چچا میاں نے افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے! ہم ہیں نا چچا میاں، ہم سے زیادہ عقل مند تو اس پورے محلّے میں کوئی نہیں ہے۔" اُول نے اپنے کرتے کا کالر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اور چستی کا یہ عالم ہے کہ ایک منٹ میں دس سموسے کھا لیتا ہوں۔" جلول نے اپنی تعریف میں بھی اپنے مطلب کی بات کہہ دی تھی۔

"ہاں؟" چچا میاں کے منہ سے حیرانی سے بے ساختہ نکلا۔

"ارے چچا میاں! اس کا مطلب ہے کہ دس سموسے بنا سکتا ہوں۔" اُول نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، تو تم لوگ آج سے ہی کام پر لگ جاؤ، لیکن یاد رہے آج تمہاری ذہانت کا اور پھرتیلے ہونے کا امتحان ہے، لہٰذا یہ دکان میں تم دونوں کے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔" چچا میاں چار و ناچار ان دونوں کو ایک موقع دیتے ہوئے کہنے لگے اور دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ کیا پتا اس سے ان پر لگا بے وقوفی کا داغ مٹ جائے اور محلّے والے ان کا تمسخر نہ اڑائیں۔

چچا میاں دکان اُول جلول کے سپرد کر گئے اور جاتے جاتے کہہ گئے:

"تمہارے پاس صرف دو گھنٹے کا وقت ہے، اگر مال منافع میں بیچا تو تم دونوں کی نوکری پکی۔"

☆......

اُول نے جلول سے کہا:

"کوئی نہ کوئی ترکیب لڑانی پڑے گی، جس کی وجہ سے ہم حلوائی کی تمام چیزیں فروخت کر سکیں۔"

"لیکن اُول مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے، میں تو کہتا ہوں واپس چلتے ہیں مجھ سے نہیں ہو پائے گا کچھ بھی۔" جلول نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"اُول نے غصّے سے کہا:"

"تم کیا چاہتے ہو کہ ساری زندگی لوگ ہمیں بے وقوف کہتے رہیں؟"

"نہیں! لیکن قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے؟" جلول سب کچھ قسمت کے سر دھر کر وہاں سے رفو چکر ہونے کے چکر میں لگا تھا۔

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔"

اُول نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" جلول جو سموسوں پر نیت لگائے بیٹھا تھا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"اگر ہم ایک جلیبی کے ساتھ چار جلیبی مفت دیں، تو ہم با آسانی تمام مٹھائیاں فروخت کر سکتے ہیں۔" اُول نے اپنی ترکیب جلول کے گوش گزار کی۔

"اور سموسے؟" جلول نے پھر سے سموسوں کی بات کی۔

"وہ تو چچا میاں خوش ہو کر تمھیں انعام میں دے دیں گے۔" اُول نے جلول کو لالچ دے کر کام پر لگا دیا۔ دونوں نے وقت ضائع کیے بغیر آوازیں لگانی شروع کر دیں:

"ایک مٹھائی کے بدلے چار مٹھائیاں بالکل مفت ایک جلیبی کے ساتھ چار جلیبیاں بالکل مفت۔"

جب محلّے والوں نے اُول جلول کو حلوائی والے کی دکان پر آواز لگاتے ہوئے پایا، تو اس موقع کو غنیمت جانا اور آن کی آن میں بھیڑ لگ گئی۔

ایک بھلے مانس آدمی نے جو کہ چچا میاں کے مخلصین میں سے تھا، تمام حال چچا میاں کے گوش گزار کر آیا۔ چچا میاں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے چلے آئے اور کہنے لگے:

"ارے نالائقو بے وقوفو! تمھیں موقع اس لیے دیا تھا تاکہ تم اپنی قابلیت کا لوہا منوا سکو، پر الٹا تم نے نقصان کروا دیا۔"

"پر چچا میاں! ہم نے اپنی عقل مندی سے تمہاری مٹھائی فروخت کی ہے۔ بجائے شکریہ کرنے کے ہمیں ڈانٹ رہے ہو، بتاؤ بھلا پہلے کبھی اتنی بھیڑ لگی ہے تمہاری دکان پر؟" اُول نے خفا ہوتے ہوئے کہا اور اپنی عقل مندی کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"ارے! تم لوگ عقل مند نہیں، عقل بند ہو، عقل بند۔" چچا میاں غصّے سے لاٹھی لے کر اُول جلول کو مارنے کے لیے بھاگے اور سب محلّے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

☆......☆......☆

مختصر کہانیاں

سموگ کیا ہے؟

عرفان حیدر

یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھی۔ جنید اپنے دادا کے ساتھ سکول جا رہا تھا۔ دونوں نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے، جس وجہ سے انھیں اتنی ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے منہ پر سرجیکل ماسک بھی لگا رکھے تھے۔

''دادا جان کل سکول میں مس منال نے بتایا تھا کہ آپ سب ماسک کا استعمال کریں۔ سموگ اس سال کئی گنا بڑھ گئی ہے، یہ آپ کو بیمار کر سکتی ہے۔'' جنید اپنے دادا جان سے مخاطب ہوا۔

''جی بیٹا! سموگ ہمارے لیے بہت خطرناک ہوتی ہے۔'' دادا جان نے اس کی بات کی تائید کی۔

''دادا جان! سموگ ہوتی کیا چیز ہے؟'' جنید نے سوال کیا۔

''بیٹا! جب فضاء میں موجود زہریلی گیسیں اوس کے ساتھ ملتی ہیں تو یہ سموگ بن جاتی ہے۔'' دادا جان نے جواب دیا۔

''سموگ ہمیں نقصان کیسے پہنچاتی ہے؟'' جنید نے ایک اور سوال پوچھا۔

''دیکھو بیٹا! ہم جس فضاء میں سانس لیتے ہیں یہ سموگ اسی فضاء میں شامل ہو جاتی ہے۔ جب ہم سانس لیتے ہیں تو یہ سموگ ہمارے جسم میں داخل ہو جاتی ہے، سموگ میں موجود زہریلے مادے ہمارے جسم کے کئی اعضاء خصوصاً پھیپھڑوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔'' دادا جان نے جنید کو سمجھایا۔

''ہوں، مطلب یہ ہمارے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ہے، لیکن ہم اس سموگ سے بچ کیسے سکتے ہیں۔'' جنید نے پوچھا۔

''سموگ فضائی آلودگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اگر ہم ان تمام سرگرمیوں کو کم کر دیں جو فضاء کو آلودہ کرتی ہیں تو ہم سموگ پر بھی قابو پا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم درخت زیادہ سے زیادہ لگائیں تو بھی ہماری فضاء آلودگی سے پاک ہو سکتی ہے۔ سموگ سے بچنے کیلئے ماسک کا استعمال بھی بہت ضروری ہے۔'' دادا جان نے اسے تفصیلاً بتایا۔

''جی دادا جان! میں آپ کی تمام باتیں سمجھ گیا ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ!'' جنید نے دادا جان سے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''شاباش بیٹا!'' دادا جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اب وہ جنید کے سکول تک پہنچ گئے تھے۔ جنید دادا جان کو اللہ حافظ کہتا ہوا سکول داخل ہو گیا۔

پکوڑے کیوں نہیں بنائے؟

مایا بتول

رمضان کا مہینہ تھا۔ آج پندرھواں روزہ ہے۔ علی کچن میں آیا اور امّی سے پوچھا۔

''آج افطاری میں کیا کیا ہے؟'' امّی نے کہا:

''دہی بڑے، پھل، جوس وغیرہ۔'' علی نے کہا:

''امّی جان پکوڑے کیوں نہیں بنائے؟ آپ کو پتا ہے نا کے مجھے پکوڑے کتنے پسند ہیں۔ پکوڑوں کے بغیر مجھ سے روزہ نہیں کھولا جاتا۔'' امّی نے کہا:

''بیٹا گھر میں بیسن ختم ہو گیا تھا۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کے اشرف انکل کی دکان سے جا کر بیسن لے آؤ۔ آپ نے کہا تھا بعد میں لے آؤں گا پھر شاید آپ کو یاد نہیں رہا۔'' علی کو بہت غصہ آیا وہ پیر پٹختے ہوئے گھر سے باہر چلا گیا۔ افطاری کا وقت قریب تھا اور علی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی امّی بہت پریشان ہو رہی تھی۔ اُدھر علی منہ لٹکائے چلا جا رہا تھا۔ راستے میں اسے اس کا دوست ارحم مل گیا۔

''علی تم یہاں کیا کر رہے ہو، افطاری کا وقت ہو گیا ہے۔'' علی خاموش رہا۔

''علی! آج تم افطاری میرے ساتھ کرلو۔ چلو آؤ میرے ساتھ''۔ علی اس کے ساتھ چلنے لگا دونوں باتیں کرتے کرتے ارحم کے گھر پہنچ گئے۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئے تھوڑی دیر بعد روزہ کھل گیا۔ ارحم کی امّی ان کے لیے افطاری کا سامان لے آئیں۔ علی اور ارحم نے روزہ کھولنے کی دعا پڑھی۔ علی نے پلیٹ کی طرف دیکھا جس میں ایک کھجور اور دو روٹیاں تھیں اور ساتھ ایک کٹوری میں دال تھی۔ علی افطاری کا یہ سامان دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے اپنے گھر کی افطاری یاد آئی جس میں طرح طرح کی نعمتیں ہوتی تھی اور آج وہ صرف پکوڑے نہ ہونے کی وجہ سے ناراض ہو کر باقی نعمتوں کو بھی چھوڑ آیا تھا۔ ارحم کے گھر کی سادہ افطاری دیکھ کر اسے اپنی ناشکری کا احساس ہوا۔ وہ خاموشی سے افطاری پر نظریں جمائے اللہ سے معافی مانگ رہا تھا۔ اس کی خاموشی کو دیکھ کر ارحم اور اس کی امّی کچھ اور ہی سمجھے۔ ارحم کے ابو ایک فیکٹری میں ملازم تھے۔ آج کل اوور ٹائم لگا رہے تھے اس لیے روزہ بھی وہیں افطار کرتے تھے۔

''مجھے پتا ہے یہ افطاری تمھاری لائق نہیں ہے۔'' ارحم نے کہا تو علی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''نہیں، نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، میں کچھ سوچ رہا تھا۔'' علی نے روزہ افطار کیا اور کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ارحم سے جانے کی اجازت مانگی۔

''بیٹا! آپ اتنی دیر تک کہاں تھے، روزہ افطار کیا ہے یا نہیں؟'' علی گھر واپس آیا تو امی نے پوچھا۔ علی نے امی کو ساری بات بتائی اور اپنی حرکت پر شرمندگی ظاہر کی۔

''کل سے آپ افطاری کی ایک ٹرے ارحم کے گھر دے آیا کرنا اور میں تمھارے ابو سے کہہ کر ان کے ہاں راشن بھی بھجوا دوں گی۔ ایسے خود دار لوگ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے بھلے کتنے ہی ضرورت مند ہوں۔ ہمیں خود ہی ان کی مدد کرنی چاہیے۔'' علی خوش ہو گیا اور اس نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اسے بے شمار نعمتیں عطا کی تھی۔

نماز ہے فرض

بنت مسعود احمد

آج کافی دن بعد سورج نے اپنی چھب دکھلائی تھی ورنہ کئی دن سے آسمان پر بادلوں نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور آج اسکول کی بھی چھٹی تھی سنی ناشتہ کر کے اپنا ہوم ورک لے کر بیٹھ گیا پھر کچھ دیر ڈرائنگ کی اس کے بعد اس نے اپنا بستہ بند کر کے جگہ پر رکھا۔ اب کیا کروں؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ کھڑکی سے آتے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا وہ کھڑکی بند کرنے کے ارادے سے جوں ہی کھڑکی تک پہنچا تو باہر پھیلی نرم گرم دھوپ اسے بڑی بھلی محسوس ہوئی وہ صحن میں لگے پودے دیکھنے لگا امی کچھ دیر پہلے ہی صحن کی صفائی کر کے پودوں کو پانی دے آئی تھی۔

''واہ! پودے کتنے خوش لگ رہے ہیں نہا کر۔'' اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور بولا اچانک برابر والے گھر کا دروازہ کھلا اور فہد اپنے گھر سے باہر نکلا اسے دیکھتے ہی سنی کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا وہ فوراً امی کے پاس آیا اور باہر کھیلنے کے لیے اجازت مانگی۔ امی نے اسے اجازت دے دی اور یاددہانی کروائی کہ نیچے صحن میں ہی کھیلنا۔ باہر گلی یا سڑک پر نہیں۔ وہ ''جی امی'' کہتا اپنی گیند اور بلا لے کر نیچے دروازے تک آیا۔ باہر نکل کر اس نے فہد کو آواز دی۔

''فہد آؤ مل کر کھیلیں'' سنی نے ہاتھ میں پکڑا گیند بلا دکھا کر اسے اپنے گھر بلانا چاہا۔

''نہیں میں ابھی کھیلنے نہیں آسکتا ابھی مجھے دادا جی کے ساتھ مسجد جانا ہے۔'' فہد میاں ایک دم سنجیدگی سے بولے۔

''خیریت تم مسجد کیوں جا رہے ہو؟ کیا سپارہ پڑھنے؟'' سنی نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں نہیں! سپارہ پڑھانے تو قاری صاحب آتے ہیں نا، میں تو نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔'' فہد کی بات سن کر سنی زور سے ہنسا۔

''تم اتنے چھوٹے ہو تم کیسے نماز پڑھ سکتے ہو ابھی؟ نماز تو بڑے پڑھتے ہیں۔ ہم تو بچے ہیں، ابھی ہم بہت چھوٹے ہیں۔'' سنی اسے سمجھاتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولا۔

''میں اب بڑا ہو چکا ہوں۔ پورے دس سال کا۔ میری امی کہتی ہیں کہ دس سال کی عمر سے نماز شروع کر دینی چاہیے، اس طرح اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہوتے ہیں۔'' فہد نے سنی کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''دس سال کا تو میں بھی ہو چکا ہوں تو کیا مجھے بھی پڑھنی ہوگی اب؟''

سنی کے لہجے میں فکرمندی در آئی۔ ''ہاں! بالکل تمھیں بھی پڑھنی چاہیے، یہ تو ہر مسلمان پر فرض ہے اور ہم تم مسلمان ہی تو ہیں۔''

''فہد تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری اسلامیات کی ٹیچر یہی بتاتی ہیں کہ نماز ہر مسلمان پر دن میں پانچ بار فرض ہے۔'' سنی کو ٹیچر کی بات یاد آئی تو فوراً بولا۔

''لیکن سنی نماز سے پہلے وضو کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کا طریقہ مجھے امی نے سکھایا ہے پر ابھی میں پوچھ پوچھ کر ہی کرتا ہوں۔ جب یاد ہو جائے گا تو خود کروں گا۔''

''مجھے بھی وضو کرنا نہیں آتا میں بھی اپنی مما سے سیکھ کر آج سے نماز شروع کرتا ہوں۔''

''ہاں ہاں! تم گھر جاؤ ابھی بھی ظہر کا وقت ہوا ہے میں بھی ظہر کی نماز پڑھنے ہی جا رہا ہوں پھر شام میں کھیلیں گے۔'' فہد نے دادا جی کو باہر آتے دیکھ کر کہا تو سنی اس کا شکریہ ادا کرتا اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

شانی اور مانی

مبشرہ خالد

''تم دونوں پھر لڑ رہے ہو؟'' لڑنا ان دونوں کا روز کا معمول تھا اسکول سے گھر میں داخل ہوتے اور لڑنا شروع کر دیتے بات صرف اونچا بولنا پر تک نہیں رہتی تھی۔ بلکہ ہاتھا پائی تک بھی جا پہنچتی کبھی کبھار ان کی والدہ غصے میں آکر کہتی یوں محسوس ہوتا ہے گویا تم دونوں پیدا ہی لڑنے کے لیے ہوئے ہو مگر اب انھوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس لڑائی کا کوئی ایسا حل سوچے گی کہ جس سے سبق ملے اور وہ آئندہ لڑنا ہی بھول جائیں۔

اس لیے جب آج دونوں نے لڑنا شروع کیا تو انھوں نے کہا۔

''شانی اور مانی میری ایک بات کان کھول کر سن لو اگر اب تم دونوں لڑے تو تم دونوں کا پسندیدہ کھانا مچھلی تم دونوں کو نہیں ملے گی۔ جب شانی نے یہ بات سنی تو اس نے سوچا تھوڑی دیر کی بات ہے لڑائی کے بارے میں سوچنے کے بجائے مچھلی کے بارے میں سوچتا ہوں اماں کے ہاتھ کی مچھلی بے حد لذیذ ہوتی ہے خوب مسالے دار اس مانی سے لڑنے کا حاصل حصول تو کچھ ہے نہیں اگر نہ لڑنے سے مزید ار مچھلی مل رہی ہے تو لڑائی کو چھوڑنا ہی بہتر ہے مگر مانی یہ سوچ رہا تھا کہ وہ شانی کو لڑنے کے لیے اکساتا ہے اور پھر اماں سے کہے گا کہ لڑائی کی شروعات شانی نے کی ہے اور مچھلی کا اکیلا حقدار بن جائے گا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ شانی غصے کا تیز ہے اس کی معمولی سی بھی شرارت اسے لڑنے کے لیے اکسا سکتی ہے اس

لیے اس نے موقع دیکھتے ہوئے جب شانی کی نظریں اس پر سے ہٹیں تو پیچھے سے اسے چٹکی بھری ایسا کرنے کی دیر تھی شانی نے اپنا نوکیلے ناخنوں والا پنجہ مانی کے منہ پر گاڑ دیا اور مانی کا چہرہ زخمی ہوگیا اس کے رونے کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگی بی ماتو بھاگتی ہوئی آئیں مانی کی آنکھیں بچ گئی تھیں مگر ناک اور منہ کو نقصان پہنچا تھا شانی نے اپنے نوکیلے ناخنوں کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا گہری رنگت ہونے کے باعث معمولی زخم بھی اس کو داغدار نہیں بناتے تھے مگر مانی کے سفید ہونے کے باعث معمولی سا زخم بھی صاف اور واضح دکھائی دیتا۔

مانی کی یہ حالت دیکھ کر بی ماتو کا پارہ سوا نیزے پر پہنچ گیا اور وہ چلائیں۔

”شانی میں نے لڑنے سے منع کیا تھا اور تم نے مانی کو اس برے طریقے سے مارا۔“

”پہلے مانی نے چٹکی بھری تھی۔“ شانی نے احتجاج کیا۔

”مگر اماں دیکھیے اس نے میرے ساتھ کیا کیا اب آپ مجھے تو مچھلی نہیں دیں گی؟“ مانی کو اپنی چوٹ کی کوئی فکر نہیں تھی اگر تھی تو صرف مچھلی کھانے کی اسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونا تھا۔

”میں نے لڑنے سے منع کیا تھا مگر ایک بات واضح ہے کہ تم نے لڑنے کا آغاز کیا جس کا جواب شانی نے اپنے غصیلے مزاج کے مطابق دیا اس لیے دونوں میں سے کسی کو بھی مچھلی نہیں ملے گی یہ کہتے ہوئے بی ماتو چلی گئیں۔

اس طرح مانی کو یہ سبق مل گیا کہ اگر آپ دوسروں سے کچھ چھیننے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اکثر آپ کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور شانی کو یہ کہ اکثر غصہ کرنے سے آپ اپنا ہی نقصان کر بیٹھتے ہیں اس لیے غصہ پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آپ خود کو نقصان سے بچا سکے۔

اس لیے ساتھیو! دوسروں کے لیے ہمیشہ اچھا سوچیے اور غصہ سے خود کو دور رکھیں تاکہ آپ ایک منفرد شخصیت کے مالک بن سکیں۔

خواب

منیحہ طاہر

دسمبر کا مہینہ تھا۔ اندر اور باہر، ہر جگہ خوب ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ موسم ایسا تھا کہ بندہ بشر لحاف اور رضائی میں دبک کر خوشیاں منا رہے تھے۔ ایسے میں ایک عام سی گڑیا اپنا کمرہ روشن کیے ہوئے بیٹھی تھی۔ وہ رات کے اڑھائی بجے موبائل فون نہیں استعمال کر رہی تھی اور نہ ہی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ نہیں وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر بھی نہیں جاگی تھی، بلکہ کچھ ایسے خواب اس کی آنکھوں میں تھے جو اس کو سونے ہی نہ دیتے تھے۔ وہ ایک لیکچرر بننا چاہتی تھی۔ مگر یہ اس کا خواب نہیں تھا اس کا خواب تھا اپنے وطن عزیز کے لیے کچھ کرنا۔ مگر وہ نہ ہی فورسز سے منسلک ہونا چاہتی تھی اور نہ ہی سیاست سے، وہ ایک عام شہری بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔

جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہوئے اسے وقت کا پتا ہی نہ چلا اور فجر کی اذان ہونے لگی۔ اور اذان کے ہوتے ہی شیطان اسے سلانے لگ گیا۔

جب سے سردیوں کی تعطیلات ہوئی تھیں یہ ہی اس کا روز کا معمول تھا۔ ساری رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزارنے کے بعد فجر کے وقت اسے نیند آنے لگتی۔ مگر وہ خود کو اپنے والدِ محترم کی بات یاد دلا کر بستر سے نکلتی کہ

”اذان اللہ تعالیٰ کی پکار ہے اور جب ہم اپنے ماں باپ یا کسی عزیز کی پکار پر ایک سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر دوڑے جاتے ہیں تو پھر اللہ تو ہمارا خالق اور مالک ہے تو اس کے پاس ہم دوڑ کر کیوں نہیں جاتے؟“ اور یہ ہی بات اسے اپنے نرم گرم بستر سے نکالنے کا سبب بنی تھی۔ جب وہ نماز ادا کر کے آئی تو معمول کے مطابق نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ اب وہ اپنے آج کے دن کے لیے پلاننگ کرنے لگی۔ اس کی ڈائری کے صفحۂ اوّل پر درج تھا۔

”جو شخص کوئی کام کرنے کا پختہ عزم کر لیتا ہے تو اس کی ابتدا چھوٹے قدموں سے ہوتی ہے۔ بڑی چھلانگیں لگانے والا گر نے کو اپنا مقدر بنا لیتا ہے۔“ یہ پڑھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے صفحہ پلٹا تو اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ کیونکہ اس پر لکھا تھا:

”اور میرا پہلا قدم ہے خود کو گندگی پھیلانے سے روکنا اور دوسرا قدم ہے۔“ وہ جوں جوں پڑھتی جا رہی تھی اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی اور مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

رزق حلال

لائقہ جبیں

یہ کہانی ہے طیب اور سلمان کی۔ دونوں بچپن کے دوست ہیں۔ ایک ہی سکول میں پڑھتے ہیں۔ دونوں غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ طیب اور سلمان روز اسکول کے بعد اپنے گاؤں میں موجود باغیچے میں پھولوں کا گلدستہ بنانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کا مالک انہیں روز ایک سو بیس روپے معاوضہ دیتا ہے۔ وہ روز اسکول کے بعد اپنے کام پر جاتے اور اپنے کمائے ہوئے پیسے گھر جا کر اپنی امی کو دے دیتے۔ ایک دن ان کے اسکول میں اسپورٹس ڈے تھا جس میں الگ الگ کھیل کے منفرد یونیفارم منتخب کیے جاتے ہیں۔ طیب اور سلمان دونوں شوق کے باعث حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اب ان کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ وہ کھیل کے لیے منتخب کردہ رنگ کا یونیفارم کیسے لیں۔ دونوں اسکول کے بعد باغیچے میں بیٹھے یہ ہی سوچ رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی پھولوں کے گلدستے بنا رہے ہوتے ہیں۔ طیب کو پیاس لگتی ہے وہ پانی لینے کے لیے چلا جاتا ہے۔ اسی وقت سلمان گلدستے دیکھتا ہوا سوچتا ہے کیوں نہ ان میں سے دو گلدستے میں لے لوں، مالک کون سا روز پھول گنتا ہے، اسے

کہہ دیں گے کہ آج پھول کم تھے اسی لئے دو گلدستے کم بنے ہیں۔ طیب کے آنے سے پہلے وہ دو گلدستے اپنے بیگ میں ڈال لیتا ہے۔ جب طیب واپس آ کر گلدستے مکمل کرنے کے بعد گنتا ہے تو وہ روزانہ کے مقابلے دو کم ہوتے ہیں۔ سلمان اسے کہتا ہے کہ آج پھول کم ہیں شاید اور طیب اپنے دوست کی بات مان لیتا ہے اور سارے گلدستے باغیچے کے مالک کے پاس لے آتا ہے جب مالک دو گلدستے کم ہونے کی وجہ دریافت کرتا ہے تو طیب اسے بتاتا ہے کہ آج پھول کم تھے۔ مالک طیب کو ایک ہزار روپے دیتا ہے اور کہتا ہے دو گلدستے بازار سے خرید لاؤ، میں نے دس گلدستوں کا آرڈر لیا ہے۔ یہ آٹھ ہیں طیب وہ پیسے لے کر بازار کی جانب چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف سلمان چوری کیے گئے گلدستوں کو بازار میں ایک ہزار روپے کا فروخت کر دیتا ہے۔ طیب بازار سے دو گلدستے خرید کر مالک کو لا دیتا ہے لیکن گلدستے دیکھ کر اسے وہ گلدستے اپنے باغیچے کے پھولوں جیسے لگتے ہیں۔ جب مالک وہ گلدستے دیکھتا ہے تو فوراً پہچان جاتا ہے کیونکہ وہ گلدستے بھی باقی گلدستوں کی طرح ہوتے ہیں اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ اسی کے باغیچے کے گلدستے ہیں مالک سلمان کو نوکری سے نکال دیتا ہے اور طیب کو انعام کے طور پر ایک ہزار روپے دے دیتا ہے۔ جس سے طیب اپنا یونیفارم خرید لیتا ہے۔ سلمان کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ طیب کے پاس معافی مانگنے آتا ہے تو طیب اسے کہتا ہے بعض اوقات خود صبر نہ کرنے اور عجلت سے کام لینے کی وجہ سے ہم رزق حلال کو اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں حالانکہ جو کچھ رب العزت نے قسمت میں لکھا ہوتا ہے اس سے زیادہ اسے نہیں ملتا۔ سلمان کی بے صبری سے کام لینے کی وجہ سے وہ چوری کر کے اللہ کے سامنے بھی گنہگار ہوتا ہے اور نوکری سے بھی محروم ہوتا ہے، جب کہ طیب کے صبر کرنے کی وجہ سے اللہ نے اس کو انعام اور رزق حلال عطا کیا۔

جنگل کی پریشانی

رفعت امان اللہ

''پیاری چڑیا کو کیا ہو گیا ہے؟ کل سے نڈھال ہے۔'' بلبل نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''ہاں اسے انہیں چند دنوں سے کھانسی رہی تھی اور اب کل سے تیز بخار میں تپ رہی ہے'' ہدہد نے سرد آہ بھرتے ہوئے بتایا وہ دونوں چڑیا کے سرہانے افسردہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مینڈک ادھر آ نکلا اور ان کی پریشانی بھانپتے ہوئے اسے کبوتر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ کبوتر نے چڑیا کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور بتایا کہ ننھی چڑیا کو پھیپھڑوں میں انفیکشن ہے اور اس وجہ سے اسے سانس لینے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ انفیکشن کیا ہوتا ہے؟ بلبل نے حیرانی سے پوچھا۔

''آج کل یہ بیماری زور پکڑ رہی ہے اور پرندے اور معصوم جانور اس کا شکار بن رہے ہیں۔'' کبوتر نے بتایا۔

''مطلب یہ بیماری شیر خان سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟'' بلبل کو فکر ہوئی۔

''دیکھو بچو! اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں میں لوگ دخل اندازی کرتے ہیں تو اس کا حسن بگاڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے پیارے پیارے درخت، پہاڑ، جنگل، ندی نالے اور دریا بنائے ہیں تا کہ انسان، جانور، پرندے اور حشرات وغیرہ سب مل جل کر رہ سکیں مگر انسان خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کو ٹھیک سے استعمال نہیں کرتا۔ وہ نا صرف درخت کاٹ دیتا ہے بلکہ کارخانے اور فیکٹریاں لگا کر آلودگی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ کیا تم انسانی علاقوں میں ہر طرف دھواں، گرد و غبار اور کوڑے کے ڈھیر نہیں دیکھتے؟ ترقی کی دوڑ جیتنے کے لئے انسان نے اپنی صحت کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے اسپتال مریضوں سے بھرے ہوئے ہیں اور اب ہم جیسے جانور اور پرندے بھی کئی تکالیف کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہمارے گھر ختم ہو رہے ہیں۔ دانہ دنکا چگنے کے لئے بھی ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہماری نسلیں ختم ہو رہی ہیں۔''

''کیا پی چڑیا اچھی ہو جائے گی؟'' ہدہد نے سوال کیا تو کبوتر نے جواب دیا کہ:

''جب ہم بیمار کا اچھے سے خیال رکھتے ہیں اور اسے وقت پہ دوا کھلاتے ہیں تو اس کی صحت جلد بہتری کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔''

''مگر میری ماما تو کہتی ہیں کہ اللہ سے دعا مانگنا بھی ضروری ہے۔'' ہدہد نے معصومانہ چہرہ بنا کر پوچھا تو کبوتر کو ہنسی آ گئی اور وہ پیار سے اس کے پاس آیا اور اسے سمجھایا کہ واقعی اللہ کے فضل کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ کی والدہ صحیح فرماتی ہیں۔''

ان دونوں نے پی چڑیا کا بہت خیال رکھا۔ وہ جلد ہی ٹھیک ہو گئی اور پھر سے اڑنے لگی دانہ چگنے لگی۔ جب وہ ٹھیک ہو گئی تو اس نے سب پرندوں اور جانوروں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ:

''جب میں بیمار تھی اور مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہوتی تھی تو میں نے اپنے آپ سے ایک عہد کیا تھا کہ جب میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو ہم سب مل کر جنگل کا خیال رکھیں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ پیڑ پودے اگائیں گے۔''

''ہم پیڑ پودے کیسے اگا سکتے ہیں؟'' بلبل نے سوال کیا۔

''بہت آسان ہے۔ ہم پرندے درختوں سے بیج جمع کریں گے۔ خرگوش چچا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ زمین کھودیں گے۔ اور ہاتھی بھائی ان پودوں کو پانی دیا کریں گے۔ یوں مل جل کر محنت کرنے سے ہم اپنے جنگل کا خیال رکھ سکتے ہیں۔''

''کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔''

زرافے میاں بھی بول اٹھے:

''تو ٹھیک ہے آج سے مشن شروع'' یہ کہہ کر ہدہد نے اڑان بھری اور بیج جمع کرنے چلا گیا سب جانور اور پرندے نئے مشن کے لیے چل پڑے۔ وہ سب بہت خوش اور پرعزم تھے۔ آخر انہیں اپنا گھر یعنی جنگل بہت پیارا تھا۔ ☆

چٹکلے

حسن عمر

ایک بھکاری نے ایک آدمی کو روک کر کہا:

''خدا کے لئے مجھے پیسے دے دو ورنہ مجھے کچھ ایسا خوفناک کرنا پڑے گا جس کے خیال سے ہی میری روح کانپ جاتی ہے، میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سارے جسم میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔''

اس آدمی نے جلدی سے اس بھکاری کو پیسے دیئے اور اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

''یہ تو بتاؤ ایسا کون سا خوفناک کام کرنا پڑتا تمہیں؟''

بھکاری بے حد اطمینان سے بولا:

''محنت مزدوری والا کام''

ایک دفعہ ایک چور چوری کی نیت سے ایک گھر میں گھسا اور تجوری کے قریب گیا، وہاں تجوری کے پاس ایک کاغذ چسپاں تھا جس پر لکھا تھا: اس تجوری کا تالہ خراب ہے، یہ کھلی ہوئی ہے!

چور نے جوں ہی تجوری کا ہینڈل گھمایا، اچانک سائرن بجنے لگا اور فوراً پولیس آگئی اور اسے پکڑ لیا۔ عدالت میں چور سے جب جج نے کہا کہ وہ اپنے حق میں کچھ کہنا چاہتا ہے تو بتائے۔ تو چور نے کہا:

''جج صاحب! میں بس ایک چیز کہنا چاہتا ہوں، انسانیت سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے۔''

آثار قدیمہ کا ایک ماہر پرانی چیزوں کی تلاش میں شہر شہر گاؤں گاؤں گھومتا پھر رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک دکان پر اس کو ایک قیمتی اور بہت پرانے زمانے کا ایک پیالہ نظر آیا جس میں دکاندار کی بلی دودھ پی رہی تھی۔ اس نے سوچا اگر دکاندار سے پیالہ مانگا تو وہ پیالے کی اہمیت سمجھ جائے گا اور خوب قیمت وصول کرے گا۔ چنانچہ اس نے بے حد اصرار کے بعد پانچ ہزار میں بلی خرید لی۔ بلی خریدنے کے بعد اس نے دکاندار سے کہا:

''یہ پیالہ بھی دے دو، کیونکہ بلی اس پیالے کی عادی ہے۔''

دکاندار اس کی بات سن کر بولا:

''میاں بیوقوف کسی اور کو بنانا۔ اس پیالے کے چکر میں، میں اب تک سو بلیاں بیچ چکا ہوں۔''

طفیل اور کمال دو دوست تھے۔ ایک دن طفیل نے کمال سے پوچھا:

''سناؤ بھئی کمال تمہارے امتحان کا کیا نتیجہ رہا؟''

کمال بے حد خوشی سے بتانے لگا:

''میں تو پاس ہو گیا! تم بتاؤ تمہارا کیا بنا؟''

''میرے نام کا پہلا حرف اڑ گیا!''

طفیل نے اترے ہوئے منہ کے ساتھ جواب دیا۔

ایک دوست: اگر کسی بیوقوف کو مصروف رکھنا ہو تو کیا کیا جائے؟

دوسرا دوست: اسے ایک گول کمرے میں خاموشی سے کونے میں بیٹھنے کو کہہ دو۔

آنٹی توڑ پھوڑ کی آمد

فرزین لہرا

آج صبح سے صبا کو لگ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے، لیکن کیا؟ وہ اُس کا ننھا سا دل بتانے سے قاصر تھا۔ وہ اپنی امّی کے پاس بیٹھ گئی، امّی آج پتہ نہیں دل کیوں گھبرا رہا ہے امّی نے اپنے فراخ پیشانی پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے گھور کر کہا:

”بیٹا جی! آپ روز نماز پڑھنا جو بھول جاتی ہیں تو بھلا دل کو کہاں سے سکون ملے گا؟ جائیں نماز پڑھیں جا کر“ صبا ڈانٹ سن کر فوراً ہی امّی کے پاس سے تو دو گیارہ ہو گئی اور کمرے میں پہنچ کر نماز پڑھنے لگی، نماز میں بھی اس کو یہی خیال ستاتا رہا کہ ایسا کیا ہونے والا ہے جس کی گواہی میرا دل مجھے ابھی سے دے رہا ہے۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ اپنی کتابیں نکال کر ابھی بیٹھی ہی تھی دروازے کی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی، وہ باہر آئی تو دیکھا امّی دروازہ کھول رہی ہیں اور آنٹی توڑ پھوڑ گھر میں داخل ہو رہی ہیں۔ آنٹی توڑ پھوڑ کا اصل نام تو تہمینہ پروین تھا لیکن وہ جہاں بھی ہوتی وہاں کوئی چیز سالم نہ رہتی اسی لئے ان کا نام آنٹی توڑ پھوڑ رکھ دیا گیا تھا، یہ اور بات تھی کہ کسی کی بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ ان کے منہ پر یہ نام لے سکتا۔

آنٹی توڑ پھوڑ نے لاؤنج میں بت بنی صبا کو دیکھا تو کیسی ہو صبا کا نعرہ لگاتے ہوئے اس کی طرف بڑھیں، صبا گڑبڑا کر اپنی سوچوں کے سمندر سے باہر آئی اور خود کو ان کے حملے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے لگی، آنٹی توڑ پھوڑ نے صبا کے قریب پہنچ کر اسے جوش سے بھینچ لیا ساتھ ہی کچھ ٹوٹنے کی آواز صبا کے کانوں سے ٹکرائی۔ پہلے تو صبا کو لگا کہ اس کی پسلیاں داغِ مفارقت دے گئی ہیں لیکن خود کو سالم کھڑے پا کر آنٹی توڑ پھوڑ کے عقب میں دیکھا تو بڑا سا گلدان زمین پر ریزہ ریزہ پڑا تھا۔ آنٹی توڑ پھوڑ اپنی کارکردگی سے بے نیاز صبا کو اپنے بازوؤں کے شکنجے میں لئے کھڑی تھیں جب کہ امّی فوراً ہی گلدان کے ٹکڑوں کو سمیٹنے کے لئے جھاڑو لگانے لگیں۔ صبا نے بمشکل خود کو آنٹی توڑ پھوڑ سے الگ کیا اور مروتاً طبیعت پوچھنے لگی جب کہ اس کو اپنی طبیعت اب خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ آنٹی توڑ پھوڑ اپنے کارنامے سے بے نیاز صبا کو لئے لاؤنج میں چلی آئیں اور وہیں پڑے صوفوں میں سے ایک پر براجمان ہو گئی۔ صبا نے قدرے فاصلے پر پڑے دوسرے صوفے پر بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔

”ہاں بھئی صبا! اور سناؤ کیسی جا رہی ہے پڑھائی؟“ آنٹی توڑ پھوڑ نے ایک بازو صوفے کی پشت پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ صبا کی نظروں نے ان کے پھیلے ہوئے بازو کے قریب دھری تپائی پر سجے نازک شوپیس کو الوداعی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: ”جی آنٹی! بہت اچھی جا رہی ہے“ اب کے آنٹی نے اپنا پرس اس تپائی پر بڑی شان بے نیازی سے رکھ دیا اور خود صبا کی طرف ہی متوجہ رہیں۔

"ہم بھی تمہاری عمر میں تو ہم خود پڑھا کرتے تھے تم تو یقیناً ٹیوشن لیتی ہوگی؟ یہ آج کل کے بچے بھی نا بہت کند ذہن ہوگئے ہیں۔ مجال ہے جو کوئی بھی کام خود اپنی محنت اور سمجھ سے کریں۔ اسکول میں کچھ سمجھنے کو تیار نہیں اور گھر آ کر ٹیوشن والوں کے سر چڑھ جاتے ہیں کہ سمجھائیں آپ۔ ارے بھئی اگر اسکول میں ہی دھیان سے پڑھ لیں تو کیا ضرورت ہے ٹیوشن کی؟" صبا ہونقوں کی طرح کبھی آنٹی کو دیکھتی اور کبھی تپائی پر دھرے وہ نازک شوپیس جو کچھ دیر پہلے ہی لاؤنج کی دیدہ زیبی میں اضافہ کر رہے تھے اب آنٹی کے پرس سے ملنے والے جھٹکے سے زمین بوس ہو چکے تھے۔ قالین کی وجہ سے آواز تو نہ آئی لیکن بدقسمتی سے وہ سالم بھی نہ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے صبا نے اپنا خشک پڑتا گلا کھنکھار کر صاف کیا اور کہنا شروع کیا۔

"جی آنٹی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں نے کبھی بھی ٹیوشن نہیں لی، اور ہمیشہ ہی اپنی محنت سے پڑھتی آئی ہوں اور آپ کو پتہ ہے میں اپنی کلاس میں اول آتی ہوں" آنٹی توڑ پھوڑ نے بے توجہی سے صبا کا جواب سنا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں امی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"تہمینہ بیٹا! دوپہر کو کھانے میں کیا بناؤں تمہارے لئے؟" آنٹی توڑ پھوڑ نے متانت سے جواب دیا۔

"ارے خالہ! آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں؟ اب میں آ گئی ہوں نا تو آپ آرام کریں۔ میں اور صبا کھانا بنالیں گے۔ چلو صبا" یہ کہہ کر آنٹی توڑ پھوڑ کھڑی ہوگئیں۔ صبا نے دل ہی دل میں کچن پر آئی بلا کو ٹالنے کے لئے ساری حفاظت کی دعاؤں کو ورد کرنا شروع کیا۔ امی کا بھی رنگ اڑ گیا۔ وہ اپنے کچن کو لے کر بہت حساس تھی اور انہیں اچھے سے اندازہ تھا کہ اگر تہمینہ عرف آنٹی توڑ پھوڑ کچن میں چلی گئیں تو کچن کا کیا حال ہوگا لیکن وہ آنٹی توڑ پھوڑ ہی کیا جو کسی بات کو سن لیں۔ انہیں تو بس اپنی ہی کرنی ہوتی ہے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد صبا بے بسی سے آنٹی توڑ پھوڑ کو لئے کچن میں کھڑی تھی۔ امی بھی بے بسی کی تصویر بنی اپنے کچن کو حسرت بھری نگاہوں سے تک رہی تھی۔

"خالہ آج میں آپ کو مزیدار دال بنا کر کھلاتی ہوں۔" آنٹی توڑ پھوڑ نے بڑی شان سے اعلان کیا۔ امی نے ایک بار پھر ہمت جمع کر کہا:

"ارے تہمینہ بیٹا! تم تو مہمان ہو۔ اور گرمی بھی کتنی بلا کی پڑ رہی ہے۔ چلو تم اندر آرام سے چل کر بیٹھو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے دال چاول بنا کر کھلاتی ہوں" اب کے آنٹی توڑ پھوڑ سوچ میں پڑ گئیں، صبا نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کہا:

"آنٹی! چلیں نا۔ میں آپ کو اپنی کتابیں بھی دکھاتی ہوں یہ کہہ کر وہ آنٹی کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئی۔ ان کو جاتا دیکھ کر امی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنے کچن پر محبت بھری نظر ڈالی صبا نے کچن کو تو بچا لیا لیکن اپنے کمرے میں لے جا کر تو مانو خود اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مار دی تھی۔

آنٹی توڑ پھوڑ بڑے اطمینان سے صبا کی رائٹنگ ٹیبل کا جائزہ لے رہی تھیں۔ صبا کو اپنی رائٹنگ ٹیبل بہت پسند تھی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری چیزوں سے اسے سجایا ہوا تھا۔ اب جب آنٹی توڑ پھوڑ ایک ایک چیز اٹھا کر جائزہ لے رہی تھی تو صبا کا دل اچھل کر حلق میں آیا ہوا تھا۔

"ارے صبا! یہ کیا کھلونے جمع کر کے رکھے ہوئے ہیں میز پر؟ اگر یہ سب سجاؤ گی تو بھلا کام کیسے کرو گی؟ اور کتابیں کاپیاں کیسے کھولو گی؟ آج تمہاری میز میں سیٹ کر دیتی ہوں۔ ارے اتم بھی کیا یاد کرو گی کہ تہمینہ آنٹی نے کیا اچھی ترتیب دی ہے میز کو" یہ کہہ کر آنٹی توڑ پھوڑ نے میز پر سجی ایک نازک سی ٹوکری اٹھائی اور اس میں سارے شوپیس اٹھا اٹھا کر ڈالنے لگیں۔ صبا بے اختیار آگے بڑھ کر ان کو تھامنے لگی۔

"آنٹی! آپ کہاں لگ گئیں ان سب میں؟ چھوڑیں آپ میں کرلوں گی لیکن وہ آنٹی توڑ پھوڑ ہی کیا جو کسی کی بات سن لیں، انہوں نے وہ ٹوکری بھر کر بیڈ پر رکھ دی اب صبا نے میز پر جو مگ میں ہر رنگ کے قلم سجائے ہوئے تھے وہ ان کا دوسرا نشانہ تھے۔ آنٹی نے اب مگ کو بیڈ پر خالی کیا اور لاپرواہی سے مگ بیڈ پر اچھال دیا۔ صبا نے برق رفتاری سے مگ کیچ کر لیا ورنہ وہ بیڈ سے نیچے گرنے ہی والا تھا۔

"آنٹی ان قلم کو تو رہنے دیں نا مگ میں، سجے ہوئے رہتے ہیں" صبا نے منمناتے ہوئے کہا؛" آنٹی نے ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا:

"ارے ان سب کو تھیلی میں بھرو اور دراز میں ڈالو، پھر دیکھنا میز پر کتنی جگہ نکل آئے گی" یہ کہہ کر وہ پھر سے لکھنے کی میز کی طرف بڑھ گئیں۔ صبا کی شکل رونے والی ہو رہی تھی لیکن وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔ اب آنٹی نے سب چیزوں کو بھرنے کے لئے کسی خالی تھیلی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ صبا نے بھانپ لیا اور فوراً ہی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے ایک خالی تھیلی نکال لی۔

"آنٹی میں بھر لیتی ہوں" صبا نے یہ نازک کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن وہ آنٹی ہی کیا جو مان جائیں، انہوں نے تھیلی جھپٹ لی اور ایک کے بعد ایک نازک شوپیس اس میں ڈالنے لگیں، پھر اس کے اوپر قلم بھی انڈیل دیئے۔ شیشے کی کھنک دار آوازیں صبا کو اپنے شوپیس کے رونے کی آواز جیسی لگ رہی تھی۔ ابھی اس سے پہلے کہ یہ دردناک منظر اور بھیانک ہو جاتا کمرے کا دروازہ کھلا اور امی نے دروازے سے ہی کہا:

"چلو بیٹا! کھانا تیار ہے آجاؤ" صبا کا تو دل باغ باغ ہوگیا وہ آنٹی توڑ پھوڑ کے ساتھ کھانے کی میز پر آن بیٹھی۔

"صبا! ذرا پانی دینا" آنٹی کی آواز پر صبا نے مستعدی سے پانی کا گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ جسے انہوں نے پی کر اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ امی نے ان کی پلیٹ میں چاول ڈالے اور شوربے کا ڈونگا اٹھا ہی رہی تھی کہ ایک جھٹکے سے گلاس زمین بوس ہوگیا،

امی نے اپنے تاثرات پر قابو پائے اور نرمی سے کہا کوئی بات نہیں بس تم کھانے پر دھیان دو سب نے مل کر کھانا کھایا۔ آنٹی اس دوران اپنی باتیں کرتی رہیں کبھی چمچ گرا دیتیں تو کبھی ڈونگے سے پلیٹ میں شوربہ ڈالتے ہوئے میز پوش پر ٹپکا دیتیں۔ اللہ اللہ کر کے کھانا کھایا اور سب چائے کے لئے لاؤنج میں آ بیٹھے۔ امی آنٹی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ صبا گرما گرم مزیدار چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کے کپ ہاتھ میں دیتے ہوئے اور چائے پینے تک کے دورانیہ میں کوئی بھی چیز نہ ٹوٹنے پر صبا کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

جب چائے کا دور مکمل ہوا تو رسمی علیک سلیک کے بعد آنٹی نے اجازت چاہی اور صوفے سے اٹھ کر ابھی ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ ان کے پاؤں کے پاس پڑا خالی چائے کا کپ اڑتا ہوا لاؤنج کی داہنی دیوار سے جا ٹکرایا اور بچی ہوئی چائے سے اس دیوار پر نقش و نگار بنا گئی۔ امی نے اپنا سر تھام لیا اور صبا حیران پریشان دیوار کو اور کبھی آنٹی توڑ پھوڑ کو دیکھ رہی تھی جو ان سب باتوں سے بے نیاز امی سے گلے ملنے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور نقصان ہوتا امی نے آگے بڑھ کر خود ان کو گلے لگا لیا اور احتیاط سے دروازے کی طرف بھی خود ہی لے گئیں۔ جاتے جاتے آنٹی توڑ پھوڑ نے سب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے صبا اور اس کی امی نے فوراً ہی قبول کر لیا اور یوں دوبارہ جلد ملنے کے ارادے سے وہ رخصت ہوئیں۔

ان کے جاتے ہی امی اور صبا دیوار صاف کرنے لگیں اس کے بعد صبا اپنے کمرے میں کچھ ٹوٹے ہوئے اور کچھ سالم بچ جانے والے شو پیسز کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ مجھے صبح صبح گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ☆

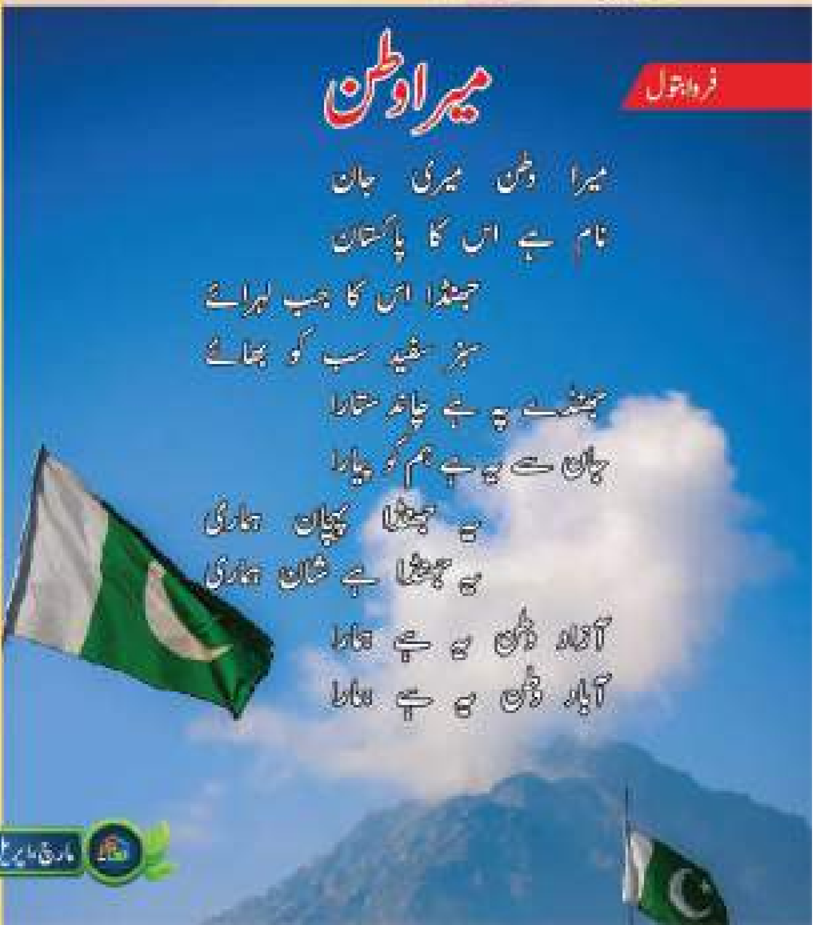

فروا بتول

میرا وطن

میرا وطن میری جان
نام ہے اس کا پاکستان
جھنڈا اس کا جب لہرائے
سبز سفید سب کو بھائے
جھنڈے پہ ہے چاند ستارا
جان سے یہ ہے ہم کو پیارا
یہ جھنڈا پہچان ہماری
یہ جھنڈا ہے شان ہماری
آزاد وطن یہ ہے ہمارا
آباد وطن یہ ہے ہمارا

بقیہ: بھوت سے ملاقات

میں نے اس کا بازو کھینچا۔

''نہیں! اب یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو شرف ملاقات حاصل کر ہی لیا جائے۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آنی ہے۔''

نائلہ ضدی ہے یہ سن رکھا تھا مگر آج یقین ہو گیا تھا۔ میں خود کو کوسنے لگی کہ نائلہ کو دعوت دی ہی کیوں؟

وہ مجھے بازو سے تھامے دھیرے دھیرے سٹور کی طرف بڑھنے لگی۔

میں نے ان چند لمحوں میں اپنے سارے گناہ یاد کر کے اللہ سے معافی مانگ لی۔

اپنے عقب میں شور سنا تو ہماری چیخ نکل گئی، ہمت مجتمع کرتے ہوئے پلٹے تو سامنے تین بلونگڑے ٹین ڈبے کے ساتھ کھیلنا چاہ رہے تھے لیکن ہماری موجودگی کی وجہ سے ہچکچاہٹ کا شکار دکھائی دے رہے تھے۔

ہماری اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔

''کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔''

پہلے تو نائلہ نے مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا کہ میں نے بلا تصدیق کیے اسے بلا لیا۔ میں کھسیانی ہوئی تو ہم دونوں کا مشترکہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔ کتنی ہی دیر ہم دونوں ہنستے رہے اور بلونگڑے بیچارے ہماری صورتیں تکتے رہے۔ ہنسی کا طوفان تھما تو ہم بلونگڑوں کے ساتھ کھیلنے کا ارادہ باندھتے ان کی طرف بڑھے۔'' ہاتھ بڑھا کر ایک کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہی تھا کہ کسی بھوت نے ہم پر حملہ کر دیا اور ہمیں خون خون کر ڈالا۔

ہماری چیخیں پورے محلے نے سنی۔ چلاتے ہوئے ہم کب ہوش سے بیگانہ ہوئے خبر نہ ہوئی۔ جب ہوش آیا خود کو بستر پر پایا، نائلہ ابھی تک دوسری دنیا کی سیر کر رہی تھی۔ باقی گھر والے آس پاس کھڑے ہمیں گھوریوں سے نواز رہے تھے۔

''وہ...... ہم...... زن...... زندہ...... ہیں...... وہ...... وہ...... بھ...... بھوت......''

''بھوت کی داستان بعد میں جان لینا پہلے بتاؤ کہ تم لوگ آدھی رات کو چھت پر کرنے کیا گئے تھے۔''

اماں جان جو سر پکڑے بیٹھی تھیں میری بات کاٹتے ہوئے گویا ہوئیں۔

میں نے جھجکتے ہوئے سارا قصہ ان کے گوش گزار کر ڈالا۔ اب گھوریوں کا رخ دادی کی جانب تھا کہ مجھ معصوم کو بھوتوں کی آمد کی یقین دہانی تو دادی جان نے ہی کروائی تھی۔

اب آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ ہماری جان خلاصی ہو گئی، ہماری درگت دو دو بار بنی، ایک طرف گھر والوں نے صلواتیں سنائیں تو دوسری طرف دادی کی چپل نے سواگت کیا۔

بھوت سے ملاقات تو نہ ہو سکی ہاں وہ رات ہمیشہ کے لیے دل و دماغ پر نقش ہو گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بلی صاحبہ تھی، جو اپنے بلونگڑے کے دفاع کے لئے ہم پر جھپٹی تھی۔ ☆

چچا چھپن بنے یوٹیوبر

محمد مبشر عطاری

"میاں اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں، سارا دن گھر میں فارغ رہ کر ہم ذہنی مریض ہوئے جارہے ہیں۔" چچا چھپن نے اپنے مخصوص انداز میں چائے کی چسکی لیتے ہوئے اپنے ہمسائے عبید سے پوچھا جس سے ان کی اچھی خاصی دوستی تھی اور اب وہ ڈھابے پر بیٹھے چائے پینے میں مصروف تھے۔

"میں تو کہتا ہوں چچا آپ اپنا یوٹیوب چینل بنالیں، گھر بیٹھے کمائی اور مزے ہی مزے۔" عبید نے دانت نکالتے ہوئے کہا تو چچا چھپن نے اپنے منہ کو تھوڑا نیچے کیا اور پھر منہ کے عجیب وغریب زاویے بنا کر عبید کی طرف دیکھنے لگے۔

"یہ کونسی بلا ہے بھئی۔"

"چچا آپ کو یوٹیوب کا نہیں پتہ، ویسے مجھے لگا کہ آپ جیسے ذہین اور قابل شخص کو تو پتہ ہوگا" عبید نے چچا کو مکھن لگاتے ہوئے کہا:

"یہ ایک موبائل ایپ ہے، جس میں ویڈیو بنا کر اپ لوڈ کرنے سے آپ کو پیسے ملتے ہیں۔" عبید نے بات مکمل کی۔

"اچھا ویسے میں ذہین تو بہت ہوں" چچا چھپن نے کالر جھاڑتے ہوئے سورج کی جانب فخریہ انداز سے دیکھا تو ایک عدد کوے کی بیٹھ ان کی عینک پر گری جس پر چچا ہائے کہتے ہوئے گھر کی جانب دوڑے اور پیچھے عبید بیٹھا ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔

چچا چھپن کا اصل نام محمد نوید تھا لیکن محلے میں وہ چچا چھپن کے نام سے مشہور تھے۔ جس کی وجہ ان کی بونگیاں یعنی بیوقوفی تھی اور چچا چھپن کو چھپن ایکڑ رقبہ وراثت میں ملا تھا جن پر ان کے ملازم کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اسی لیے ان کا نام بھی چچا چھپن پڑ گیا تھا۔ اور اتنے رقبے کی وجہ سے ہی ان کے بقول انہیں کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اب گھر میں فارغ پڑے رہنے سے انہیں بھی کوفت ہونے لگی تھی۔

''یاسر، یاسر سر'' چچا چھپن اپنے بھتیجے یاسر سے مخاطب تھے جو کہ موبائل فون پر کوئی کام کرنے میں مصروف تھا۔

''کیا ہوا چچا؟'' اس نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے یوٹیوب چینل بنا دو ایک سوہنا سا'' چچا چھپن نے اپنی ضرورت سامنے رکھی۔

''میں نہیں بنا رہا'' یاسر نے بے دھیانی سے کہا۔

''دیکھو لوگ کھانے کا سودا نہ کرو، جب ہم یوٹیوب سے شہرت پا کر کسی ٹی وی پروگرام میں جائیں گے تو تمہارا نام ضرور لیں گے'' چچا نے طنزیہ منہ بناتے ہوئے رخ پھیرا تو یاسر یہ سن کر بمشکل ہنسی کو روک پایا اور کہنے لگا۔

''اچھا جی بنا رہا ہوں چینل'' یاسر نے رضامندی ظاہر کی تو چچا چھپن بھی نخرے دکھاتے آخر مسکرا ہی اٹھے۔

''نام کیا رکھنا ہے چینل کا'' یاسر نے چچا چھپن سے کہا:

''اوئے ہوئے ہوئے ہوئے، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں میاں، چلو ایسا کریں گے کہ ہم اس چینل پر مختلف اقسام کے کھانے بنائیں گے، تم چینل بنا دو اور اس کو نام دو نوید و کے پکوان۔'' یاسر نے چینل کا نام سنا تو ایک لمحہ کے لیے اسے ایسا لگا کہ جیسے چچا ''نوید کے پکوان'' کہہ رہے ہوں خیر کافی تگ و دو کے بعد یاسر نے چچا کے لیے کوکنگ چینل ''نوید و کے پکوان'' بنا دیا۔

''چچا اب چینل تو بن گیا پہلی ویڈیو کونسی اپ لوڈ کرنی ہے، جس کو چینل کا انٹرو یعنی تعارف کہا جاتا ہے'' یاسر نے پوچھا۔

''کیا بن سکتا ہے؟ چلو انٹرو میں ہم پودینہ کی چٹنی بنانا سکھائیں گے۔''

چچا چھپن نے کہا اور اپنی تشریف کا ٹوکرا باورچی خانے کی جانب لے جانے لگے اور یاسر کو بھی موبائل سمیت وہاں آنے کا اشارہ کیا۔

''السلام علیکم! ناظرین آپ دیکھ رہے ہیں نوید و کے پکوان اور میں ہوں آپ کا شیف محمد نوید، آج میں یعنی ہم'' چچا نے ہم کہا تو یاسر انہیں ٹوکنے لگا۔

''چچا ہم نہیں کہنا ویڈیو میں، لوگ ہنسیں گے۔''

''تم بس ویڈیو بنا'' چچا نے یاسر کی بات رد کرتے ہوئے اسے ویڈیو جاری رکھنے کا حکم صادر کیا۔

''او ہو ناظرین! یہ تو پودینہ ہمارے پاس ختم ہو گیا چلیں دھنیے کی پودینے والی چٹنی بنانا سکھا دیتے ہیں۔''

سب سے پہلے آپ نے دھنیے کو دھو لینا ہے، اور ایک طرف دہی کو ابلنے کے لیے رکھ دینا ہے، اب دھنیے کی ڈنڈیوں سے پتے علیحدہ کر کے اسے ابلتے ہوئے دہی میں ڈال دینا ہے اور دہی کے ابلنے کا انتظار کرنا ہے، جب تک کہ میں آپ کو اپنا تعارف پیش کرتا ہوں چچا نے عجیب و غریب ترکیب بتانے کے بعد اپنا تعارف کروانے لگے یہاں تک دہی ابل کر باہر آ گیا۔

''او ہو ناظرین! یہ کیا ہو گیا ہے چلیں کچھ نہیں ہوا ہماری دھنیے سے تیار شدہ پودینے والی چٹنی تیار ہے'' چچا نے بمشکل حالات کو سنبھالتے ہوئے کہا اور اسی کے ساتھ ویڈیو مکمل ہو گئی۔

''ہاہاہاہا'' یاسر ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔

''کون سی چٹنی کو ابالا جاتا ہے وہ بھی دہی والی؟''

''تم مجھے بتا نہیں سکتے تھے کہ دہی ابلنے والا ہے'' چچا چھپن نے سنجیدگی سے کہا تو یاسر نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''میں نے سوچا کہ آپ کی ترکیب میں کیوں اپنی ٹانگ اڑاؤں۔''

''چلو خیر اب دیکھنا ہزاروں نہیں لاکھوں نہیں کروڑوں لوگ کل صبح تک میری ویڈیو کو دیکھ لیں گے اور میں راتوں رات مشہور ہو جاؤں گا۔'' چچا چھپن نے فخریہ انداز میں کہتے ہوئے آسمان کی جانب منہ کیا تو انہیں صبح والا پرندہ یاد آ گیا۔

''جی تو محمد نوید صاحب مجھے یقین ہے کہ آپ کو ہمارے اس شو میں آ کر اچھا محسوس ہو رہا ہوگا اور یقیناً ہمارے لیے بھی یہ ایک اعزاز ہے کہ آپ ہمارے مہمان بنے'' نیوز اینکر نے چچا چھپن سے کہا۔

ان کی ایک کے بعد ایک ویڈیو نیٹ پر آتی رہی تھی اور وہ بہت مشہور ہو چکے تھے۔

''اچھا تو یہ بتائیے کہ کامیابی کے اس سفر کا پہلا قدم کیسے اور کس کے کہنے پر اٹھایا؟''

''اصل میں بات کچھ یوں ہے کہ'' چچا چھپن نے نیوز اینکر کے سوال کا جواب دینا شروع کیا تو نیوز اینکر نے انہیں ٹوکا ''چچا'' ''چچا'' چچا چھپن نے نیوز اینکر کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر اس نے کئی بار پھر انہیں چچا کہا تو چچا چھپن نیند سے جاگ گئے۔

''او ہو یاسر مجھے کیوں اٹھایا ہے اتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا'' چچا چھپن نے ناراضگی سے کہا۔

''میں تو آپ کو بتانے آیا تھا کہ آپ کی ویڈیو کو'' یاسر نے تجسس بڑھانے کے لیے گفتگو روک دی۔

''ویڈیو کو کیا؟ کتنے لوگوں نے دیکھ لیا اور پسند کیا'' چچا چھپن نے یاسر کا بازو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے پر تجسس انداز میں کہا۔

دیکھا تو ہے لوگوں نے مگر جس جس نے دیکھا اتنی فضول ترکیب کا مذاق اڑا رہے ہیں کہ پہلے خود تو کچھ بنانا سیکھو پھر ہمیں بھی سکھانا۔

''چلو یاسر! ڈیلیٹ کرو یہ چینل وینل اور مجھے سونے دو اتنی اچھی ویڈیو تو یوٹیوب پر مجھے اپ لوڈ ہی نہیں کرنی چاہیے تھی، سوشل میڈیا کہاں جانے ایسی ویڈیوز کی قدر'' چچا چھپن نے برا منہ بناتے ہوئے یاسر کو حکم دیا اور بستر پر دراز ہو گئے۔ ☆☆

قارئین کے کھٹے میٹھے اور دلچسپ خطوط والا منفرد سلسلہ!

ماہنامہ الف نگر جنوری فروری 2022 کا خوبصورت فل رنگین اور سال نو کی مبارکباد پیش کرتا جگمگاتا ایک دن پہلے ہی موصول ہوا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ خوبصورت سبزہ زار میں پھول، تتلی، چڑیا اور ننھے بچوں سے سجا خوبصورت سرورق دل کو بھا گیا۔

الف نامہ میں نئے سال میں کچھ نیا کرنے اور خلوص دل سے کرنے پہ زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عمیرہ احمد کے نئے جاسوسی اور تہلکہ خیز ناول کی خبر سن کر بہت اچھا لگا۔

سب سے پہلے نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دل کو منور کیا۔ صائمہ آصف بہت بہت مبارکباد۔ اللہ کی رحمت سے کبھی بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ کہ اللہ کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ سمیعہ علی یمن نے اپنی تحریر اللہ کی رحمت میں یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

قراۃ العین خرم ہاشمی کی سائنس فکشن تحریر امید کے دریچے بھی زبردست رہی۔ مشہور زمانہ سائنس دان البرٹ آئن سٹائن پہ لکھی آمنہ ارشد کی تحریر گوہر نایاب بہت ہی عمدہ اور دلچسپ لگی۔ اندھیروں کی مایوسیوں سے امید کی صبح روشن پہ ایمان رکھنے والے ایک نوجوان کی کہانی۔ فائزہ تسنیم کی ایک خوبصورت تحریر رہی۔ مریخ سے آئے ایک ایلین ،چون، کی کہانی جو سیر کرنے آیا اور زمین والوں کا دوست بن گیا۔ عرفان حیدر کی خوبصورت تحریر مریخ سے آیا خط۔۔

طویل اور خوبصورت نظم نیا سال کے ساتھ حاضر ہیں پیارے بھائی اور بہت ہی خوبصورت شاعر ارسلان اللہ خان۔ بہت ہی خوبصورت نظم پڑھنے کو ملی۔

پرستان میں کچھ غلط ہو رہا تھا اور یہ کیوں ہو رہا تھا۔ کیوں کہ وہاں کے رہنے والے ایک دوسرے کے ساتھ مخلص نہیں تھے۔ حسد، جلن اور بغض رکھتے تھے۔ اُمید نو بہار کے بیج پوری نیک نیتی اور خلوص سے لگاتے ہی سب ٹھیک ہو گیا اور پرستان میں خوشیوں کے رنگ بکھرنے لگے۔ ایڈیٹر عائشہ اطہر صاحبہ کی ایک خوبصورت تحریر اُمید نو بہار۔

پرندوں سے دوستی پہ مبنی سلمان یوسف سمیجہ کی ایک خوبصورت تحریر تحریر اور پرندے ہمیشہ کی طرح دلچسپ اور زبردست لگی۔ یہ ملک ہمارا گھر ہے اور گھر کو صاف ستھرا رکھنا ہمارا فرض ہے۔ فرزین لہرا کی تحریر روشن صبح میں یہی بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

انعم اعظم کی تحریر وہ کون تھا بھی اچھی لگی۔ کیسے بھی حالات ہوں گھبرانا نہیں چاہیے۔ کیونکہ مشکل کے بعد منزل ہے۔ بنت مسعود اپنی تحریر بھوری میں یہی بتا رہی ہیں۔

راستے سے بھٹک جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن بھٹک کر سنبھل جانا واقعی بہت بڑی بات ہے۔ وہ بھی بھٹک گیا تھا مگر جلد ہی سنبھل بھی گیا۔ گرتے ہیں شہ سواری میں یہی بتایا گیا ہے۔ روبینہ کبیر خان کی ایک خوبصورت تحریر۔ سیدہ اقرا اعجاز کی تحریر نیا محلول زبردست لگی۔ مختصر مگر پر مزاح تحریر چچا خوامخواہ نے جھگڑا چھڑوا دیا بے حد دلچسپ رہی۔ عائشہ اطہر صاحبہ کی بہترین تحریر۔ اسکاؤٹنگ کے حوالے سے بہترین معلومات فراہم کرتی ایک خوبصورت سی تحریر اسکاؤٹنگ الطاف حسین کے قلم سے پڑھنے کو ملی۔ موبائل فون ٹیبلٹ ویڈیو گیمز زیادہ دیر تک کھیلنا، استعمال کرنا نقصان دہ ہے۔ یہ انسان کو سست اور نکما کر دیتا ہے۔ صحت مندانہ مشاغل اپنانے چاہئیں۔ ایک پرانا دور عمر میں نعمہ نقلیل یہی پیغام دیتی نظر آتی ہیں۔

نامور ادیب امان اللہ نیر شوکت کی تحریر پراسرار ہاتھ کی پہلی قسط پڑھنے کو ملی۔ ابھی کچھ واضح نہیں ہوا کہ پراسرار ہاتھ کس کا ہے کیا چاہتا ہے امید ہے اگلی قسط میں سب ظاہر ہو جائے گا۔ مایہ ناز لکھاری عارف مجید عارف کی ایک خوبصورت تحریر اللہ کا دوست بہت اچھی لگی۔

کہانیوں کے تڑکے کے ساتھ ساتھ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شیف ثانی گاجر کا حلوہ بنانا سکھا رہی ہیں۔ ضرور ٹرائی کیجیے گا۔

کرونا وبا کے پس منظر میں لکھی ایک بہت ہی زبردست اور پیاری تحریر امید سحر پیش کر رہے ہیں اختر سردار چودھری صاحب۔ ہر اندھیرے کے بعد اجالا ہے۔ مشکل کے بعد آسانی ہے بس ذرا ہمت اور حوصلے کی بات ہوتی ہے۔ امید سحر ضرور ہوتی ہے۔ بہت عمدہ بہت زبردست۔ تاجر نے اپنے بیٹوں کو منافع کا سودا کرنے کا کہا۔ تو چھوٹے بیٹے نے علم کی شمع روشن کرنے کو ترجیح دی۔ حسن عمر کی تحریر منافع کا سودا کا لب لباب یہی ہے۔

عزت چھوٹا یا بڑا ہونے میں نہیں بلکہ اخلاق اور بھائی چارے میں ہے۔ اونٹ کی یہی اکڑ اسے لے ڈوبتی اگر عین وقت پہ وہ سنبھل نہ جاتا۔ ایک دلچسپ اور بہترین تحریر کون چھوٹا کون بڑا جاوید بسام کے قلم سے۔

آخری صفحات پہ مختصر کہانیوں میں دعا اسماء کی ہادیہ کی نیکی، مایا بتول کی نعمت، ماریہ زاہد کی خوفناک حویلی اور ایبا بتول کی مختصر مگر پر اثر تحریر چڑیا اور چوہا بھی بہت زبردست لگیں۔

میل ملاقات میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ کھٹے میٹھے اور گرما گرم خطوط خوب محظوظ کرتے ہیں۔ ہار نمبر پہ قراۃ العین خرم ہاشمی، سیدہ اقرا اعجاز، علینہ فرحان اور سلمان یوسف سمیجہ کے تبصرے شاندار لگے۔

سال نو کے پہلے شمارے پہ تبصرہ مکمل ہوا آپ کو کیسا لگا۔ یہ ضرور بتائیے گا اللہ حافظ۔

محمد رمضان شاکر (پاکپتن)

☆ اتنے عمدہ اور تفصیلی تبصرے کے لیے شکر گزار ہیں۔ اُمید ہے کہ اتنا عمدہ تبصرہ اب باقاعدگی سے آیا کرے گا۔

الف کتاب پبلی کیشنز کی بچوں کے لیے خوبصورت رنگین کتابیں!

آرڈر کے لیے رابطہ کریں! 0321 8460220

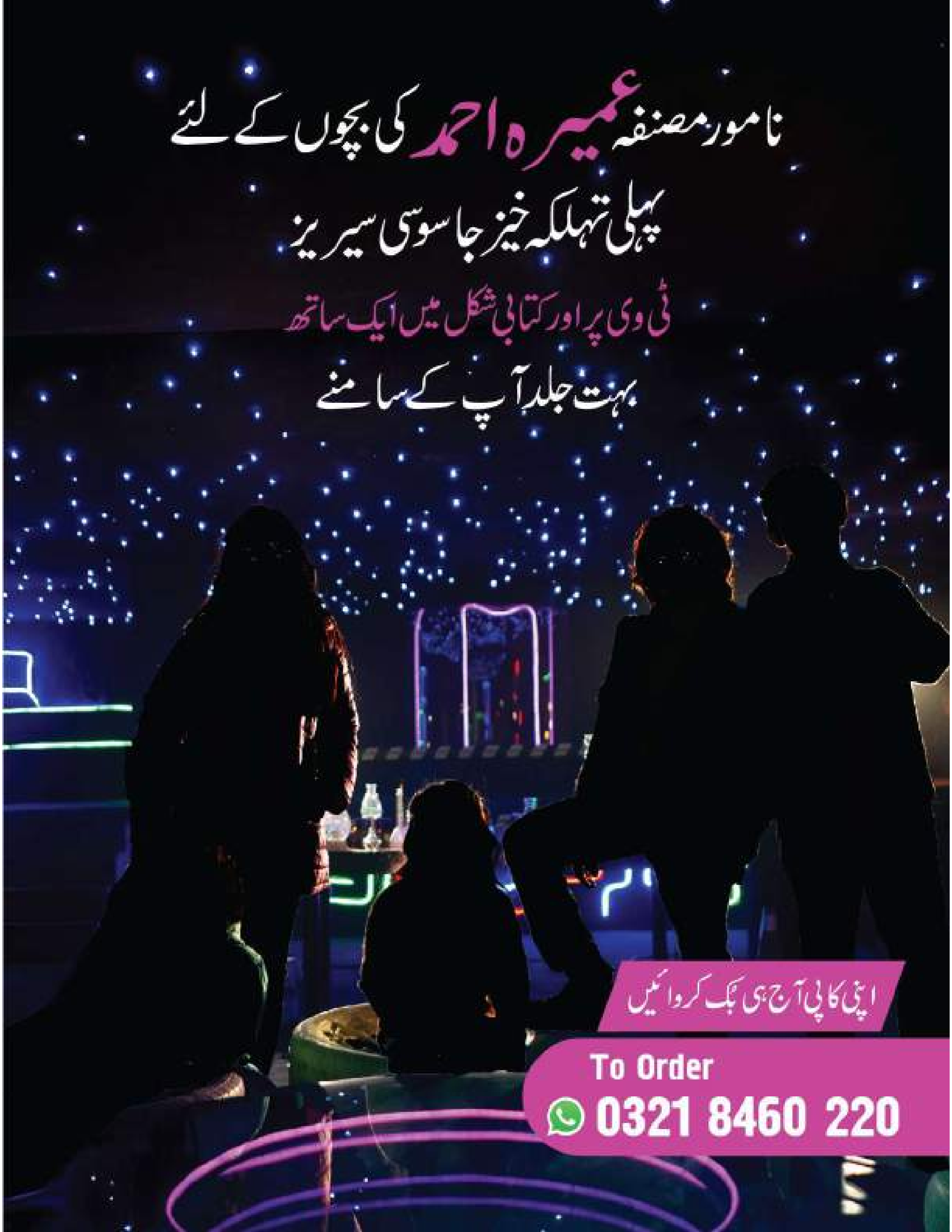

نامور مصنفہ عمیرہ احمد کی بچوں کے لئے
پہلی تہلکہ خیز جاسوسی سیریز
ٹی وی پر اور کتابی شکل میں ایک ساتھ
بہت جلد آپ کے سامنے
اپنی کاپی آج ہی بک کروائیں
To Order
0321 8460 220